داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

عوامی ایڈیشن

- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ حصوں پر مشتمل مکمل سیٹ، مع مضبوط باکس

رمضان المبارک کے دوران 2200 روپے کے بجائے

صرف
1000 روپے میں
(علاوہ ڈاک خرچ 150 روپے)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

جون ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خصوصی مضمون

قرآن اور رمضان

جمیل الرحمٰن عباسی

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 67
شمارہ : 6
رمضان المبارک 1439ھ
جون 2018ء
فی شمارہ -/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	300 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری   مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ____ 5
مسئلۂ فلسطین کا فطری حل — ادارہ

بیانُ القرآن ____ 9
سورۃ سبا (آیات ۲۲ تا ۵۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خصوصی مضمون ____ 27
قرآن اور رمضان — جمیل الرحمٰن عباسی

ظروف و احوال ____ 66
پاکستان کا بیانیہ — شجاع الدین شیخ

انوارِ ہدایت ____ 81
ذکر اللہ کی اہمیت و فضیلت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تذکیر و موعظت ____ 85
شوال کے روزے: فضیلت اور احکام — پروفیسر عبدالعظیم جانباز

وہ کیا گردوں تھا......! ____ 91
اقبال کا پیغام: اُمتِ مُسلمہ کے نام — محمد ندیم اعوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ فلسطین کا فطری حل

بالآخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ مسلمان ممالک کی باہمی کشیدگی‘ عناد اور داخلی انتشار کا نتیجہ اس صورت میں نکلنے لگا ہے کہ اب اسلام دشمن قوتیں بلا خوف وخطر اور بے دھڑک مسلمانوں کو روندتے ہوئے اپنے اہداف ومقاصد کی تکمیل کی طرف بڑھنے لگی ہیں۔ یروشلم میں امریکی سفارتخانہ کا افتتاح ان حالات میں کیا گیا کہ اس غاصبانہ اقدام کے خلاف احتجاج کرنے اور اپنی آزادی اور حق خودارادیت کی دہائی دینے والے نہتے فلسطینیوں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے ۶۰ سے زائد فلسطینیوں کو شہید اور ۲۷۰۰ کے لگ بھگ کو زخمی کر دیا گیا۔ اسرائیلی فوجی سنائپرز سے تاک تاک کر مظاہرین کو نشانہ بناتے رہے۔ احتجاج کو دبانے اور اپنی طاقت کی دھاک بٹھانے کے لیے اسرائیلی فضائیہ اور ڈرونز کا بھی بے دریغ استعمال کیا گیا اور اس ضمن میں تمام اخلاقی وانسانی تقاضوں اور بین الاقوامی قوانین وضوابط کی دھجیاں اُڑا دی گئیں۔ یہاں تک کہ زخمیوں کو لے جانے والی ایمبولینسز اور میڈیا کی گاڑیوں تک کو نہ بخشا گیا۔

بین الاقوامی ضوابط ہر قوم کی آزادی وخودمختاری اور عزت واحترام کی تائید کرتے ہیں۔ خود اقوام متحدہ کے چارٹر کی دوسری شق حق خودارادیت وخودمختاری کی تاکید کرتی ہے۔ اس ضمن میں جنرل اسمبلی کی قرارداد نمبر ۱۵۳۵ اور ۲۶۲۷ سمیت کئی قراردادوں میں فلسطینیوں کے حق آزادی کی حمایت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ضابطہ ہے کہ کسی بھی ملک کے کسی علاقے پر جنگ کے ذریعے کیا گیا قبضہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ خود یورپی یونین کا اعلامیہ اس بات پر گواہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ فلسطین پر صہیونی قبضہ غاصبانہ ہے‘ خاص طور پر یروشلم پر تو اس ضابطے کے مطابق اسرائیل کا قبضہ تسلیم کیا ہی نہیں جا سکتا‘ کیونکہ یروشلم پر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یروشلم میں اسرائیلی دارالخلافہ کا قیام اور امریکی سفارتخانہ کی منتقلی دونوں بین الاقوامی قوانین وضوابط کی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ لہٰذا ایسا تو کسی صورت ہونا ہی نہیں چاہیے‘ کجا یہ کہ فلسطینیوں سے احتجاج کا حق بھی چھین لیا جائے اور تمام تر انسانی واخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایمبولینسز اور میڈیا کی گاڑیوں پر بھی حملے کیے جائیں۔

آخر دشمن قوتوں کے لیے مسلمانوں کے خون‘ عزّت‘ وقار‘ آزادی‘ خودمختاری اور حقوق سے کھیلنا اتنا آسان کیوں ہو گیا ہے کہ اس کے لیے کسی انسانی یا اخلاقی تقاضے کو مدِنظر رکھنے کی زحمت بھی گوارا

نہیں کی جاتی؟ کیا تمام بین الاقوامی قوانین وضوابط صرف غیر مسلموں کے حقوق ومفادات کو تحفّظ دینے کے لیے ہیں؟ مسلمانوں کے جذبات‘ احساسات‘ حقوق اور آزادی کی کوئی قیمت کیوں نہیں رہ گئی؟ کیوں چند لاکھ اسرائیلیوں کے مقابلے میں پونے دو ارب مسلمانوں کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی رہ گئی ہے؟

فوری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے ان تلخ سوالوں کا جواب صرف اتنا ہے کہ جس طرح مسلمان تعداد میں کم نہیں ہیں‘ اسی طرح طاقت اور وسائل میں بھی اسرائیل سے کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ حقیقت میں بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کی آزادی‘ حقوق‘ عزت اور وقار کو ان کے حکمرانوں نے محض اپنے ذاتی مفادات اور اقتدار کے لیے دشمن قوتوں کے ہاتھوں بیچ ڈالا ہے۔ ۶ دسمبر ۲۰۱۷ء کو جب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکی سفارتخانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا تو اس وقت حالانکہ یورپی یونین نے ٹرمپ کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی اور یونین کے وزرائے خارجہ نے اپنے مشترکہ اعلامیہ میں کہا تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء میں قبضے میں لیے گئے فلسطینی علاقوں کو اسرائیل کا حصہ نہیں سمجھتے جن میں مغربی کنارہ‘ مشرقی یروشلم اور گولان کی پہاڑیاں شامل ہیں۔ اس حوالے سے UNO کی قرارداد نمبر ۴۷۸ بھی موجود تھی اور سوائے چند ممالک کے پوری دنیا فلسطینیوں کے موقف کی حمایت کر رہی تھی‘ لیکن مسلمان حکمرانوں کا حال یہ تھا کہ سعودی عرب‘ مصر اور متحدہ عرب امارات سمیت کئی مسلم ممالک کے سربراہان OIC کے اس سربراہی اجلاس میں شریک ہی نہیں ہوئے جو امریکی صدر کے امریکی سفارتخانہ یروشلم منتقل کرنے کے اعلان کے بعد ہنگامی طور پر بلایا گیا۔ اور تو اور خلیجی ممالک کی تعاون کی کونسل (مجلس التعاون لدول الخلیج) کے مقاصد میں مسئلہ فلسطین کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ اس وقت بھی عرب ممالک کی اس سردمہری کو عالمی سطح پر واضح طور پر محسوس کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ بی بی سی نے بھی اس پر تبصرہ کیا تھا کہ: ’’۵۷ رکنی اسلامی تعاون کی تنظیم میں عرب ممالک کی شرکت اتنی حوصلہ افزا نظر نہیں آتی جس سے یہ کہا جا سکے کہ امریکی صدر کے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دینے کا فیصلہ واپس ہو سکے گا۔‘‘

حقیقت واضح ہے کہ امریکہ اور اسرائیل چاہے کتنے ہی بڑے دشمن کیوں نہ ہوں وہ مسلمانوں کو اس طرح نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا وہ مسلم حکمرانوں کے دوغلے اور مفاد پرستانہ طرزِ عمل کی وجہ سے پہنچا رہے ہیں۔ دنیا میں پونے دو ارب مسلمان ہیں اور ۵۷ اسلامی ممالک۔ اگر یہ اسلامی ممالک امریکہ اور اسرائیل سے سفارتی اور تجارتی بائیکاٹ کا اعلان کر دیں تو وہ کچھ ہی عرصہ میں مسلمانوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے اور مذاکرات کی میز پر آ کر تمام مسائل مسلمانوں کی شرائط کے مطابق حل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ موجودہ دور میں کسی بھی ملک کی اصل طاقت کا راز اس کی معیشت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر امریکہ کی معیشت کا دارومدار تو ہے ہی زیادہ تر عرب ممالک کے تیل اور ان کو اسلحہ کی فروخت پر۔ لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ صرف عرب ممالک ہی امریکہ اور اسرائیل کو لگام ڈالنے

کے لیے کافی ہو سکتے ہیں‘ مگر یہ اس صورت میں ہوسکتا تھا جب عرب حکمرانوں کو اسلام اور مسلمانوں کا اجتماعی مفاد عزیز ہوتا۔ لیکن بجائے اس کے دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ اسلام سے جتنا خطرہ امریکہ اور اسرائیل کو محسوس ہو رہا ہے‘ اس سے زیادہ شاید عرب حکمرانوں کو محسوس ہو رہا ہے۔ کیونکہ اسلام ایک پورا نظام حیات ہے۔ اسی نظام کو عرب حکمران بھی اپنے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے امریکہ اور اسرائیل کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔ عالمِ اسلام کو جس متحدہ عرب آرمی کے حوالے سے اتنی خوش فہمیاں تھیں وہ بھی بنیادی طور اسلام کے خطرے سے نمٹنے کی ہی ایک کوشش ہے جس کی پشت پناہی بھی امریکہ اور اسرائیل کر رہے ہیں۔ سعودی عرب میں ماڈرنائزیشن کا عمل بھی انہی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ گویا اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے خلاف امریکہ‘ اسرائیل اور عرب حکمران ایک دوسرے کے اتحادی ہیں اور یہی اتحاد امریکہ اور اسرائیل کی سُپر میسی اور جارحیت کا اصل باعث ہے اور اس کی تین وجوہات ہیں۔

۱) ظاہر ہے اگر اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے لیے مصر میں سیسی مسلمانوں کو ٹینکوں تلے کچلے گا‘ شام میں بشارالاسد مسلمانوں کی پوری پوری بستیوں کا کیمیائی ہتھیاروں سے صفایا کرے گا‘ کچھ ایسی ہی سفاکیت سعودی عرب میں بھی دکھائی دے گی تو اسرائیل کو فلسطینیوں کے قتل عام کا جواز کیوں نہیں ملے گا؟

۲) عرب ممالک کے امریکہ کے ساتھ دفاعی اور تجارتی معاہدے امریکی معیشت کے استحکام کا باعث ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہی سعودی عرب نے ۳۵۰ ارب ڈالر کے معاہدے کر کے امریکہ کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو امریکہ کو اس کی معاشی فکر اجازت ہی نہ دیتی کہ وہ یروشلم میں امریکی سفارتخانہ کھولنے کا اعلان کر کے اہم عرب اتحادیوں کو ناراض کرنے کا رسک لے سکے۔ لیکن سعودی حکمرانوں کے حکمت اور دوراندیشی سے محروم فیصلوں نے امریکہ کی بدمستی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اسی طرح عربوں کا وہ سارا پیسہ جو یورپی اور امریکی بینکوں میں ہے براہ راست امریکہ اور اسرائیل کو بدمست ہاتھی بنائے ہوئے ہے۔

۳) سب سے زیادہ جو چیز مسلم حکمرانوں کو اسلام دشمن قوتوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور کرتی ہے وہ ان کا داغدار کردار ہے‘ جو انہوں نے اقتدار کے حصول کی خاطر اُمت اور اسلام کے خلاف ادا کیا۔ گویا ان کا اقتدار شروع سے ہی اسلام دشمن قوتوں کی مدد کا محتاج رہا ہے‘ لہٰذا اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اسلام دشمن قوتوں کو خوش رکھنا ان کی مجبوری ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اسلام اور اُمت کے غدار ہیں‘ لہٰذا انہیں پناہ بھی غیروں کے ساتھ اتحاد میں ہی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر فلسطین شام کا حصہ تھا اور شروع میں ہی اسرائیل سے نمٹنے کے لیے ایک شام ہی کافی تھا مگر اسرائیل کے قیام اور استحکام میں شام کے حکمران خاندان کا جو کردار رہا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ

میں اسرائیل کی فتح کو یقینی بنانے اور بعد ازاں لبنان میں شامی فوج اُتار کر فلسطینی گوریلوں کو تہ تیغ کرنے میں حافظ الاسد نے جو کردار ادا کیا اس کی تفصیل خود گولان انٹیلی جنس کے سربراہ خلیل مصطفیٰ نے اپنی کتاب ملفات طواغیت و مجرمی سوریا (سیریا کے سرکشوں اور مجرموں کی فائل) میں تمام ثبوتوں کے ساتھ درج کی ہے اور وہی انکشافات بعث پارٹی کے لیڈر سامی الخلیلی نے ٹائم میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کیے ہیں۔ لیکن حافظ الاسد کو اسی داغدار کردار کی بنا پر شام کا صدر بنا دیا گیا اور اس کا بیٹا بشارالاسد انتہائی متنازعہ ہونے کے باوجود آج بھی شام پر کیوں مسلط ہے اس کا جواب خود امریکی وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ Jeffery Feltman نے جنوری ۲۰۱۰ء میں واشنگٹن کے ہڈسن انسٹیٹیوٹ میں ان الفاظ میں دیا: ’’اسرائیل کی خواہش ہے کہ بشارالاسد کی حکومت اس قدر کمزور ہو جائے کہ وہ اس کے مخالف کسی گروہ کی مدد کرنے کے قابل نہ رہے‘ مگر وہ کسی طور پر بھی بشارالاسد حکومت کا خاتمہ نہیں چاہتا‘ اس لیے کہ اسرائیل ہی تو وہ ملک ہے جس نے بشارالاسد کو عالمی تنہائی سے نکالنے کے لیے عالمی دروازے کھلوائے‘‘۔ ظاہر ہے اگر بشارالاسد کا اقتدار صرف صہیونیوں کے دم سے قائم ہے تو وہ اسرائیل کے لیے خدمات سرانجام کیوں نہیں دے گا؟ اسی لیے فیلٹ مین نے کہا کہ بشارالاسد اسرائیل کو اس لیے عزیز ہے کیونکہ اسد خاندان نے ۱۹۷۴ء سے لے کر ۲۰۱۱ء تک اسرائیل کو ہمیشہ سکون کا سانس لینے دیا اور اس دوران اسرائیل نے نہ صرف گولان کی پہاڑیوں پر اپنا قبضہ مضبوط کیا‘ بلکہ اسے اسرائیل میں شامل بھی کر لیا۔

اسی طرح غزہ میں محصور فلسطینیوں کا بیرونی دنیا سے رابطہ‘ اشیائے خوردونوش اور ادویات پہنچانے کا واحد ذریعہ وہ سرنگیں تھیں جو مصر کی سرحد پر واقع تھیں۔ مگر جنرل السیسی نے مصر کے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی سب سے پہلے ان سرنگوں کو بند کر دیا۔ اس لیے کہ السیسی کا اقتدار بھی یہود و نصاریٰ کے مرہونِ منت ہے۔ اس کے بعد آل سعود کا اقتدار‘ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ان کا کردار‘ یہود و نصاریٰ سے دوستیاں اور تجارتی و دفاعی معاہدے کسی وضاحت کے محتاج نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی عالمی طاقت کا سرچشمہ اسلام کا اجتماعی سیاسی نظام تھا مگر حکمرانوں نے محض اقتدار کے حصول کی خاطر اس کو ختم کرنے میں اسلام دشمن قوتوں کا ساتھ دیا۔ لہٰذا مسئلہ فلسطین سمیت جتنے بھی مسائل آج اُمت مسلمہ کو درپیش ہیں ان کی بنیادی وجہ اجتماعی سیاسی نظام کا نہ ہونا ہے۔ وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ پونے دو ارب مسلمان اور ان کے حکمران دوبارہ ایک اجتماعی عادلانہ سیاسی نظام کی ضرورت کو محسوس کریں‘ کیونکہ وہی ایک فطری حل ہے جو مسلمانوں کو متحد اور منظم کر سکتا ہے۔ اسی صورت میں مسئلہ فلسطین سمیت تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں‘ مسلمان دوبارہ دنیا میں ایک قوت بن کر اُبھر سکتے ہیں اور اُمت کا وقار بھی بحال ہو سکتا ہے۔ ❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ سَبا

آیات ۲۲ تا ۳۰

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ
ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ
قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ
يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰي هُدًى اَوْ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔـلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔـلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ
يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ
الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ
اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ
عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

آیت ۲۲ ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ﴾ ’’(اے نبی ﷺ! ان مشرکین سے) کہیے کہ تم بلاؤ ان کو جنہیں تم نے (معبود) گمان کیا ہے اللہ کے سوا۔‘‘

جن دیویوں اور دیوتاؤں کو تم اپنے اولیاء اور مددگار سمجھتے ہو انہیں پکار کر دیکھ لو کہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں!

﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ ’’وہ ذرّہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے‘ نہ آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں‘‘

﴿وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾﴾ ’’اور نہ ان دونوں (زمین اور آسمان) میں ان کا کوئی حصہ ہے‘ اور نہ ہی ان میں سے کوئی اُس کا مددگار ہے۔‘‘

مشرکینِ عرب کے ہاں دو طرح کے مشرکانہ اعتقادات پائے جاتے تھے۔ ان کا ایک عقیدہ تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ محبوب ہستیاں ایسی ہیں جن کی بات کو وہ ٹال نہیں سکتا‘ چاہے وہ اُس کی بیٹیاں (وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے) ہوں یا انسانوں میں سے اس کی محبوب شخصیات۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی ان محبوب ہستیوں کی سفارش سے آخرت میں وہ بچ جائیں گے۔

ان کا دوسرا مشرکانہ عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ اللہ اس کائنات کا خالق اور مالک ہے لیکن اس نے اس کائنات کا نظام چلانے کے لیے اپنے کچھ نائبین مقرر کر کے ان میں کچھ اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح دنیا کی سلطنتوں اور حکومتوں کا نظام چلانے کے لیے تمام بادشاہ اور حکمران اپنے نائبین مقرر کر کے انہیں کچھ اختیارات تفویض کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ کے مقرر کردہ نائبین اس کائنات کا نظام چلاتے ہیں‘ اور وہ نہ صرف اللہ کے مددگار ہیں بلکہ اس کے اختیارات میں بھی شریک ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اس دوسری قسم کے مشرکانہ عقیدے کی نفی کی گئی ہے۔

اس حوالے سے یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ ہندوستانی دیو مالا (mythology) میں دیویوں اور دیوتاؤں کا جو تصور پایا جاتا ہے اس میں اور ہمارے ایمان بالملائکہ میں بظاہر بہت باریک اور نازک سا فرق ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ کائنات کے اندر فرشتے اللہ کی طرف سے تفویض شدہ مختلف فرائض ادا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے فرشتے گویا اللہ کی کائناتی حکومت کی ’’سول سروس‘‘ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے‘ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو مدد کے لیے پکارنا‘ کسی سے کسی قسم کی کوئی دعا کرنا یا استغاثہ کرنا جائز نہیں۔ کسی کے نفع یا نقصان کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے‘ اس لیے دعا کے لیے پکارنا بھی اسی کو ہے۔ استمداد بھی اسی سے ہے اور استغاثہ بھی اسی سے۔ وہ قادرِ مطلق ہے‘ وہ چاہے تو کسی کی براہِ راست مدد کر دے یا کسی کی تکلیف رفع کرنے کے لیے کسی فرشتے کو بھیج دے۔ اس کے برعکس دیو مالائی تصور یہ ہے کہ جو ہستیاں اللہ کے نائبین کے طور پر کائنات کے اندر مختلف فرائض سنبھالے

ہوئے ہیں وہ اللہ کے اختیارات میں بھی حصہ دار ہیں۔ چنانچہ ان کے حضور اپنی حاجات بھی پیش کی جاسکتی ہیں‘ ان سے دعا بھی کی جاسکتی ہے اور ان سے استغاثہ بھی کیا جاسکتا ہے‘ جس کے جواب میں وہ اپنے پکارنے والوں کی حاجت روائی بھی کرتے ہیں اور مشکل کشائی بھی۔ چنانچہ نظریاتی طور پر دیکھا جائے تو یہ باریک سا فرق دراصل زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیومالائی مشرکانہ تصورات دراصل ’’ایمان بالملائکہ‘‘ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

آیت ۲۳ ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ﴾ ’’اور نہ نفع دے گی اُس کے ہاں کوئی سفارش مگر اُسی کے حق میں جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو۔‘‘

﴿حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ’’یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے ان کے دلوں سے‘‘

یہ فرشتوں کا حال بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو کوئی حکم بھیجتا ہے تو اس کی عظمت اور جلالت کی وجہ سے ان پر دہشت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر جب ان سے اس دہشت کا اثر زائل کر دیا جاتا ہے تو:

﴿قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ﴾ ’’وہ پوچھتے ہیں تمہارے ربّ نے کیا فرمایا تھا؟‘‘

﴿قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾﴾ ’’وہ کہتے ہیں کہ (اُس نے جو کچھ فرمایا ہے وہ) حق ہے‘ اور وہ بہت بلند و بالا‘ بہت بڑا ہے۔‘‘

آیت ۲۴ ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’آپؐ (ان سے) پوچھئے کہ کون ہے جو تمہیں رزق بہم پہنچاتا ہے آسمانوں اور زمین سے؟‘‘

﴿قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾﴾ ’’آپؐ کہیے کہ اللہ! اور یقیناً ہم یا تم لوگ یا تو ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں!‘‘

یعنی ہمارے اور تمہارے عقائد و نظریات میں بُعد المشرقین ہے۔ ان متضاد عقائد میں سے صرف ایک عقیدہ ہی درست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ منطق اور عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا﴾ ’’آپؐ کہیے کہ تم سے نہیں پوچھا جائے گا

ہمارے جرائم کے بارے میں‘‘

تم سمجھتے ہو کہ ہم نے نیا دین گھڑ لیا ہے‘ ہم نے تمہارے معبودوں کو جھٹلایا ہے اور ہم نے تمہارے خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی ہے اور یوں ہم بہت سنگین جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے تم لوگ خاطر جمع رکھو‘ ہمارے ان جرائم کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ اپنے ان ’’جرائم‘‘ کا حساب ہم خود ہی دیں گے۔ یہاں پر مخالف فریق کو گمراہ کہنے کے بجائے دونوں میں سے کسی ایک فریق کی گمراہی کی بات کر کے اور ان کے الزام کے مطابق جرائم کو خود اپنی طرف منسوب کر کے ’’حکمتِ تبلیغ‘‘ کا بہت اہم سبق سمجھایا گیا ہے۔

﴿وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ’’اور نہ ہی ہم سے پوچھا جائے گا تمہارے اعمال کے بارے میں۔‘‘

تبلیغ کا حکیمانہ اسلوب ملاحظہ ہو‘ جہاں اپنے لیے لفظ ’’جرم‘‘ استعمال ہوا ہے‘ وہاں مخالف کے لیے صرف ’’عمل‘‘ کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ کسی کی مخالفانہ عصبیت کو انگیخت کا بہانہ نہ ملے اور کسی کے اندر اگر کچھ سوچنے اور غور کرنے کی آمادگی پائی جاتی ہو تو اس کا دروازہ بند نہ ہونے پائے۔

آیت ۲۶ ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾﴾

’’آپؐ کہہ دیجیے کہ ہمارا رب ہم سب کو (ایک دن) جمع کرے گا‘ پھر وہ فیصلہ کر دے گا ہمارے مابین حق کے ساتھ‘ اور وہ خوب فیصلہ کرنے والا‘ خوب جاننے والا ہے۔‘‘

اس دن جو فیصلہ بھی ہوگا بر بنائے علم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ایک شخص کی ایک ایک حرکت کا علم ہے۔

آیت ۲۷ ﴿قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾﴾

’’آپؐ کہیے کہ ذرا مجھے دکھاؤ تو وہ (معبود) جنہیں تم نے شریک بنا کر اُس کے ساتھ ملا رکھا ہے! کوئی نہیں! بلکہ وہی اللہ ہے‘ بہت زبردست‘ نہایت حکمت والا۔‘‘

وہ اپنی ذات میں خود ’’العزیز‘‘ (غالب‘ زبردست) ہے‘ اُس کی قدرت کسی اور کے بل پر قائم نہیں‘ اُسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں‘ وہ کسی اور کی مدد کا محتاج نہیں۔

آیت ۲۸ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!)

ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر‘‘

تمام انبیاء و رسل علیہم السلام میں یہ اعزاز صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے حصے میں آیا کہ آپؐ کو تمام بنی نوع انسانی کی طرف رسولؐ بنا کر بھیجا گیا۔ اس سلسلے میں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کیجئے کہ یہ فیصلہ تاریخ انسانی کے اس مرحلے پر کیا گیا جب انسانی تمدن اور ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے باعث آپ ﷺ کی دعوت کو دنیا کے کونے کونے میں ایک ایک شخص تک پہنچانا عملی طور پر ممکن ہونے کے قریب تھا۔ ورنہ اس سے پہلے عملی طور پر کسی نبی یا رسول کی دعوت کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آئے وہ مخصوص علاقوں میں ایک ایک قوم کی طرف مبعوث ہو کر آئے۔ اسی لیے آپؐ سے پہلے کے پیغمبروں کی بعثت کا تعارف قرآن حکیم میں اس طرح کرایا گیا ہے: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ﴾ (ہود: ۵۰) ﴿وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ﴾ (ہود: ۶۱) ‘ ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ﴾ (ہود: ۸۴)۔ لیکن حضور ﷺ کی بعثت کے بارے میں یہاں یوں فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾۔

﴿وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور وہ پوچھتے ہیں کہ کب پورا ہوگا یہ وعدہ‘ اگر تم لوگ سچے ہو!‘‘

مشرکین کے اس سوال میں عذاب یا قیامت دونوں کی طرف اشارہ موجود ہے کہ آپؐ ہمیں جو عذاب کی دھمکیاں دیتے ہیں یا قیامت برپا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ذرا یہ بھی تو بتائیں کہ آپؐ کے یہ وعدے کب پورے ہوں گے؟

آیت ۳۰ ﴿قُلْ لَّكُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾

’’آپؐ کہہ دیجیے کہ تمہارے لیے ایک خاص دن کی میعاد مقرر ہے‘ جس سے تم نہ تو ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے بڑھ سکو گے۔‘‘

آیات ۳۱ تا ۳۳

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ وَلَوْ

تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

آیت ۳۱ ﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ﴾

’’اور کہا ان کافروں نے کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ ہی اُس (قرآن) پر جو اس سے پہلے تھا۔‘‘

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں لفظ قرآن کا اطلاق تورات پر بھی ہوا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے سورۃ القصص کی آیت ۴۸ کی تشریح بھی مدنظر رہنی چاہیے‘ جس میں کفار کا وہ قول نقل ہوا ہے جس میں انہوں نے قرآن اور تورات کو سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا قرار دیا تھا۔ ان کے اس الزام کا مطلب یہ تھا کہ تورات اور قرآن دراصل دو جادو ہیں جنہوں نے باہم گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ تورات میں قرآن اور محمد (ﷺ) کے بارے میں پیشین گوئیاں ہیں جبکہ محمد (ﷺ) کا قرآن تورات کی تصدیق کر رہا ہے۔ اس طرح ان دونوں نے ایکا کر کے ہمارے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا ہے۔ گویا انہوں نے اپنے اس بیان کے ذریعے قرآن اور تورات کے ایک ہونے کی تصدیق کی تھی۔ آیت زیر مطالعہ میں یہی بات ایک دوسرے انداز میں بیان کی گئی ہے۔

قرآن حکیم کے اس مطالعے کے دوران یہ اصول کئی بار دہرایا جا چکا ہے کہ قرآن نے تورات کے جن احکام کی نفی نہیں کی وہ احکام حضور ﷺ نے اپنی شریعت میں قائم رکھے ہیں۔ مثلاً قتلِ مُرتد اور رجم تورات کے احکام تھے جن کو حضور ﷺ نے برقرار رکھا۔ اور اسی اصول کے تحت قرآن میں کوئی صریح حکم نہ ہونے کے باوجود بھی حضور ﷺ نے رجم کیا ہے اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے بھی رجم کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ سوائے خوارج کے اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کے تمام مکاتب فکر اس پر متفق ہیں کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ البتہ قرآن

پہلی الہامی کتابوں پر مُھَیْمِنْ (نگران) ہے یعنی اس کی حیثیت کسوٹی کی ہے۔ پہلی کتابوں کے اندر جو تحریفات ہوگئی تھیں ان کی تصحیح اس قرآن کے ذریعے ہوئی ہے۔

یہاں پر میں ایک حدیث کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نبی اکرمﷺ کے پاس ایک کتاب (تورات کا نسخہ) لے کر آئے جو انہیں اہل کتاب میں سے کسی نے دی تھی اور اسے آپﷺ کو پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ اس پر آپﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا:

((أَمُتَهَوِّكُونَ فِيهَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهٖ بَيْضَاءَ نَقِيَّةً لَا تَسْأَلُوْهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوْكُمْ بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوْا بِهٖ اَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوْا بِهٖ، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اَنْ يَّتَّبِعَنِيْ))(۱)

''اے خطاب کے بیٹے! کیا تم لوگ اس (تورات) کے بارے میں متحیر ہو؟ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمہارے پاس یہ (قرآن) روشن اور پاکیزہ اور ہر آمیزش سے پاک لے کر آیا ہوں۔ ان (اہل کتاب) سے کسی چیز کے بارے میں نہ پوچھو' مبادا وہ تمہیں حق بتائیں اور تم اس کو جھٹلا دو' یا باطل خبر دیں اور تم اس کی تصدیق کر دو۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کے پاس بھی میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔''

حضورﷺ کے اس فرمان کا مدعا بہت واضح ہے کہ قرآن کے احکام آخری اور حتمی ہیں' تورات کے کسی حکم سے قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا قرآن کے کسی حکم کے سامنے تورات کے کسی حکم کا حوالہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ ''اور کاش آپ دیکھیں جب یہ ظالم کھڑے کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے۔''

﴿يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ﴾ ''وہ ایک دوسرے کی طرف بات لوٹائیں گے۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔

(۱) البداية والنهاية لابن كثير: ۱۲۲/۲' اسناده على شرط مسلم۔

﴿يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳۱﴾ ''جو لوگ کمزور تھے وہ ان سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور مؤمن ہوتے۔''

تاویلِ خاص کے لحاظ سے یہاں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے عوام کو حضورﷺ سے برگشتہ کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتے تھے۔ چنانچہ قیامت کے دن ان کے عوام انہیں کوس رہے ہوں گے کہ اگر تم لوگ ہماری راہ میں حائل نہ ہوتے تو ہم ایمان لا چکے ہوتے اور آج ہمیں یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔

آیت ۳۲ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲﴾ ''(جواباً) وہ کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے ان سے جو کمزور تھے: کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا' اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔''

آیت ۳۳ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ''اس پر کہیں گے وہ جو کمزور تھے ان سے جو بڑے بنے ہوئے تھے بلکہ یہ (تمہاری) رات دن کی سازشیں تھیں''

﴿اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ﴾ ''جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے لیے مدِّمقابل ٹھہرائیں۔''

﴿وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ﴾ ''اور وہ چھپائیں گے ندامت کو جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔''

﴿وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ﴾ ''اور ہم نے طوق ڈال دیے ہیں ان کافروں کی گردنوں میں۔''

﴿هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۳﴾ ''ان کو بدلہ نہیں ملے گا مگر اُسی کا جو عمل وہ کرتے تھے۔''

آیات ۳۴ تا ۳۹

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

آیت ۳۴ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بھی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا مگر (ہمیشہ ایسا ہوا کہ) اُس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ جو چیز آپ دے کر بھیجے گئے ہیں ہم اُس کے منکر ہیں۔''

آیت ۳۵ ﴿وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ ہم اموال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں دولت اور اولاد جیسی نعمتوں سے نوازا گیا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہم سے خوش ہے اور ہم اس کے منظورِ نظر ہیں۔ چنانچہ جس طرح ہمیں دنیا میں خوشحالی حاصل ہے اسی طرح ہمیں آخرت میں بھی عیش کی زندگی ملے گی اور عذاب تو ہمیں بالکل بھی نہیں دیا جائے گا۔

آیت ۳۶ ﴿قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ﴾ ''آپؐ کہیے کہ یقیناً میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے (دنیا کا) رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے''

اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی نعمتوں کی تقسیم لوگوں کے اعمال یا اعتقاد کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر کسی کے ہاں مال و دولت کی کثرت ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کا منظورِ نظر ہے۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ)) (۱) ''اگر دنیا کی وقعت اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے ایک پَر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کو نہ دیتا''۔ چنانچہ جس مال اور اولاد پر یہ لوگ اتراتے پھرتے ہیں اللہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٣٦﴾ ''لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اکثر لوگ اللہ کی اس تقسیم کے فلسفے کے بارے میں لاعلم ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ رزق کی کمی یا زیادتی کا تعلق کسی انسان کے اللہ کے ہاں محبوب یا مغضوب ہونے سے نہیں ہے۔

آیت ۳۷ ﴿وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى﴾ ''اور (دیکھو!) تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیزیں نہیں کہ وہ تمہیں مرتبے میں ہمارا مقرّب بنا دیں''

﴿اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ﴾ ''سوائے اُس شخص کے جو ایمان لایا اور اُس نے نیک اعمال کیے۔''

﴿فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝٣٧﴾ ''تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا دوگنا اجر ہے اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝٣٨﴾ ''اور وہ لوگ جو کوشش کر رہے ہیں ہماری آیات کو ناکام کرنے کی وہی لوگ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔''

آیاتِ الٰہی کے نزول کا مقصد تو ایمان کی روشنی کو پھیلانا اور لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس عمل کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے

(۱) سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی ھوان الدنیا علی اللہ عزوجل۔

لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکیں گے۔

آیت ۳۹ ﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یقیناً میرا ربّ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور (جسے چاہتا ہے) اس کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔''

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ﴾ ''اور جو کچھ بھی تم لوگ خرچ کرتے ہو تو وہ اسے لوٹا دیتا ہے۔''

یعنی اللہ کی رضا کے لیے جو مال خرچ کیا جاتا ہے ایک تو اس کا اجر آخرت میں ملے گا جو دس گنا سے سات سو گنا تک ہوگا' بلکہ قرآن میں اس سے بھی زیادہ کی بشارت ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کا بدل عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہوئے انسان کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے اور دل میں یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کا نقد معاوضہ بھی عطا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے رزق کے نئے نئے مواقع پیدا فرماتا ہے اور ان کے وسائل میں خصوصی برکتیں نازل فرماتا ہے۔

﴿وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

آیات ۴۰ تا ۴۵

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًی ؕ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِیْرٍ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِیْ ۫ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴿۴۵﴾

آیت ۴۰ ﴿وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور جس دن وہ جمع کرے گا ان سب کو' پھر فرشتوں سے فرمائے گا: کیا یہ لوگ تمہیں پوجا کرتے تھے؟''

آیت ۴۱ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ﴾ ''وہ کہیں گے: تُو پاک ہے' تُو ہمارا ولی ہے ان کے سوا۔''

یعنی ہمارا آقا اور مالک تو تُو ہی ہے' ان سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔

﴿بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''بلکہ یہ لوگ جِنّات کی عبادت کیا کرتے تھے' ان کی اکثریت ان ہی پر ایمان رکھتی تھی۔''

آیت ۴۲ ﴿فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ﴾ ''تو آج کے دن تم میں سے کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا' نہ نفع کا اور نہ نقصان کا''

﴿وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور ہم کہیں گے ان ظالموں سے کہ اب چکھو اس آگ کے عذاب کا مزا جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۴۳ ﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ﴾ ''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری روشن آیات' تو وہ (آپس میں ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم کو ان سے روک دے جن کی عبادت تمہارے آباء و اَجداد کرتے تھے''

﴿وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًی ؕ﴾ ''اور وہ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے مگر ایک گھڑا ہوا جھوٹ۔''

یعنی یہ قرآن دراصل محمد (ﷺ) کا اپنا کلام ہے جس کو وہ وحی کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور ان کافروں نے حق کے بارے میں جبکہ یہ ان کے پاس آ گیا' کہا کہ یہ کچھ بھی نہیں

ہے مگر ایک کھلا ہوا جادو۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا﴾ ’’اور ہم نے انہیں ایسی کوئی کتابیں نہیں دیں جنہیں یہ پڑھتے ہوں‘‘

یعنی ان لوگوں پر ہماری طرف سے کوئی ایسی کتاب تو نازل نہیں ہوئی جس میں لکھا ہو کہ لات‘ منات اور عزّٰی وغیرہ کو ہم نے کچھ خصوصی اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ اگر ان کے پاس ان کے ایسے دعووں کی کوئی سند ہے تو پیش کریں۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۝۴۴﴾ ’’اور نہ ہی ہم نے آپؐ سے پہلے ان کی طرف کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تھا۔‘‘

حضرت اسماعیل علیہ السلام اور نبی آخر الزماں ﷺ کے درمیان تین ہزار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران بنواسماعیلؑ کے ہاں کوئی نبی یا رسول نہیں آیا۔

آیت ۴۵ ﴿وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ﴾ ’’اور ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے تھے‘‘

﴿وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ﴾ ’’اور یہ تو اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا‘‘

مثلاً قومِ عاد کو جو شان و شوکت عطا ہوئی تھی اور اپنے علاقے میں جیسا ان کا رعب و دبدبہ تھا قریشِ مکہ کو تو اُس کا عُشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہے۔

﴿فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝۴۵﴾ ’’تو انہوں نے میرے رسولوںؑ کو جھٹلایا‘ پس کیسی رہی (ان کے لیے) میری پکڑ!‘‘

آیات ۴۶ تا ۵۴

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ

شَهِيْدٌ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ قُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ ۝ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۚ ۝ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝

آیت ۴۶ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔‘‘

اس آیت کا تعلق آیت ۸ سے ہے۔ مذکورہ آیت کے ضمن میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کے دعوائے نبوت کے بارے میں مختلف لوگ مختلف آراء رکھتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ابھی شش و پنج میں تھے کہ یہ معاملہ آخر ہے کیا؟ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ کچھ سمجھتے تھے کہ انہیں جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے‘ جبکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ کسی منصوبہ بندی کے تحت جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے ہیں۔ (العیاذ باللہ!) لیکن ایسے لوگوں کے ذہنوں میں ایک بہت بڑا سوال یہ بھی گردش کرتا رہتا تھا کہ ایک ایسا شخص آخر اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے جس نے کبھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی جھوٹ نہیں بولا اور جس کو ہم خود الصادق اور الامین کا خطاب دے چکے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس بارے میں ابھی ذہنی خلجان کا شکار تھے اور کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے کہ آپؐ کی دعوت کی اصل حقیقت ہے کیا! ایسے تمام لوگوں کو ان آیات میں سنجیدہ غور و فکر پر آمادہ کرنے کے لیے دعوت دی جا رہی ہے کہ اس طرح شاید انہیں اپنے گریبانوں میں جھانکنے‘ اپنے موروثی عقائد کی عصبیت سے بالاتر ہو کر سوچنے اور کسی مثبت نتیجے پر پہنچنے کا موقع مل جائے۔ اس لحاظ سے یہ آیات بہت اہم ہیں۔

﴿اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫﴾ ’’یہ کہ تم کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے دو دو ہو کر یا اکیلے اکیلے‘ پھر غور کرو!‘‘

یعنی کسی وقت تم دو دو آدمی باہم گفتگو کر کے یا الگ الگ کچھ دیر کے لیے اپنی توجہ کو مرتکز کر کے اللہ کو اپنے سامنے تصور کرتے ہوئے کھڑے ہو جاؤ‘ پھر غور و فکر کرو۔ اگر تم اس انداز میں سنجیدگی سے غور کرو گے تو حقیقت ضرور تم پر واضح ہو جائے گی۔

﴿مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ﴾ ’’تمہارے ساتھی کو جنّون کا کوئی عارضہ نہیں ہے!‘‘

اگر کسی شخص پر جنّون یا آسیب کے اثرات ہوں تو اس کے کچھ شواہد بھی نظر آتے ہیں۔ تم لوگ ہمارے نبی ﷺ کی گزشتہ زندگی کے شب و روز کے بارے میں سوچو‘ آپؐ کی بات چیت پر غور کرو‘ آپؐ کے اخلاق و معاملات کا جائزہ لو‘ کیا تمہیں کسی بھی پہلو سے ان میں جنون کے کچھ آثار نظر آتے ہیں؟ کیا آسیب زدہ لوگوں کے اقوال و افعال اور معمولاتِ زندگی ایسے صاف ستھرے اور مثالی ہوتے ہیں؟

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾﴾ ’’وہ نہیں ہیں مگر تمہارے لیے ایک خبردار کرنے والے‘ ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے۔‘‘

آیت ۴۷ ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ﴾ ’’آپؐ کہیے کہ اگر میں نے تم سے کچھ اجرت مانگی ہو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔‘‘

یہ ایک ایسا اندازِ بیان ہے جس میں ’’نفی‘‘ کی گویا انتہا ہے کہ میں نے اس کام کے عوض اگر کوئی اجرت طلب کی ہو تو وہ تم ہی کو مبارک ہو! میں دن رات دعوت کے اس کام میں ہمہ تن مصروف ہوں‘ مگر میں اس پر تم لوگوں سے کسی قسم کی کوئی اُجرت‘ کوئی معاوضہ اور کوئی صلہ طلب نہیں کرتا۔ تم لوگ اس کلام کو کبھی شاعری کہتے ہو اور کبھی پرانے زمانے کی کہانیوں سے تشبیہہ دیتے ہو۔ مگر تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ شاعروں کی شاعری اور قصہ خوانوں کی کہانیوں کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وہ لوگ تو اپنے سامعین کا دل بہلا کر اُجرت کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اپنے کلام کی داد انعامات کی صورت میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہیں مجھ میں اور ایسے پیشہ ور فنکاروں میں واقعی کچھ فرق نظر نہیں آتا؟

﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾﴾ ’’میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے‘ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔‘‘

آیت ۴۸ ﴿قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ یقیناً

میرا رب حق کے ساتھ ضرب لگاتا ہے (باطل کو)‘ وہ خوب جاننے والا ہے تمام غیبوں کا۔‘‘

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ﴾ ’’بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے‘ پھر وہ مٹ جاتا ہے‘‘۔ آیت زیر مطالعہ کا بھی بالکل یہی مفہوم ہے‘ اس لیے یہاں ’’يَقْذِفُ بِالْحَقِّ‘‘ کے بعد ’’عَلَى الْبَاطِلِ‘‘ کے الفاظ کو محذوف سمجھا جانا چاہیے۔

آیت ۴۹ ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ حق آ گیا ہے‘‘

آپؐ اعلان کر دیجیے کہ حق کا بول بالا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب چند ہی برسوں بعد پورے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کے دین کا غلبہ ہو جائے گا۔

﴿وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾﴾ ’’اور باطل نہ تو (کسی چیز کی) ابتدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اعادہ۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ﴾ ’’آپؐ (ان سے یہ بھی) کہیے کہ اگر میں بہک گیا ہوں تو اس کا وبال میرے اوپر ہی آئے گا۔‘‘

﴿وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾﴾ ’’اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کے طفیل ہے جو میرا رب میری طرف کرتا ہے۔ یقیناً وہ خوب سننے والا‘ بہت قریب ہے۔‘‘

یہ انتہائی متواضع اندازِ بیان ہے کہ اگر بالفرض میں بہک گیا ہوں تو یہ میرے نفس کی شرارت کے باعث ہے اور اس کا وبال بھی مجھ پر ہو گا۔ اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یقیناً میرے رب کی راہنمائی کی وجہ سے ایسا ممکن ہوا ہے۔ میں اپنی محنت اور کوشش سے ہدایت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ﴾ ’’اور کاش آپ دیکھیں جب وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے‘ تب بچ نکلنا ممکن نہیں ہو گا‘‘

انسانوں کی گھبراہٹ اور پریشانی کی اس کیفیت کو سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۳ میں ’’الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کیفیت قیامت کے اس ’’زلزلے‘‘ کے باعث ہو گی جس کا ذکر

سورۃ الحج کی ابتدائی آیت میں اس طرح ہوا ہے: ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱﴾ ''یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہوگا۔''

﴿وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝۵۱﴾ ''اور وہ پکڑ لیے جائیں گے قریبی جگہ سے۔'' جیسے کوئی پاس پڑی ہوئی چیز کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیتا ہے اسی طرح انہیں آسانی کے ساتھ قابو میں کرلیا جائے گا۔

آیت ۵۲ ﴿وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۲﴾ ''اور (اُس وقت) وہ کہیں گے کہ اب ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ اور (اُس وقت) کہاں ہوگی ان کی رسائی (ایمان تک) اتنی دُور کی جگہ سے!''

''تناوش'' اور ''تناول'' ہم معنی الفاظ ہیں۔ یعنی پالینا' کسی چیز کا پہنچ میں ہونا اور اس تک رسائی ہونا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان لانے کا فائدہ تو دنیا کی زندگی میں ہے جو انسانوں کے لیے امتحانی عرصہ ہے۔ جب امتحان کی مہلت ختم ہو جائے گی تو ایمان لانے کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اس روز کسی کا ایمان لانا اسے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

آیت ۵۳ ﴿وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۳﴾ ''اور پہلے تو انہوں نے اس کا کفر کیا تھا' اور وہ (اٹکل کے) تیر تُکّے چلاتے رہے بن دیکھے دور کی جگہ سے۔''

اپنی دنیا کی زندگی میں تو وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں کبھی کہتے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں' کبھی کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں اور یہ ان کا اپنا کلام ہے' کبھی کہتے کہ انہوں نے گھر میں کوئی آدمی چھپا رکھا ہے جو انہیں یہ سب کچھ سکھاتا ہے۔ کبھی کہتے کہ ان پر جن آ گیا ہے۔ بہرحال جب ان کے سوچنے اور ایمان لانے کا موقع تھا اس وقت تو وہ قرآن اور اللہ کے رسول ﷺ کا انکار کرتے رہے اور ان کے بارے میں بغیر کسی علمی اور عقلی دلیل کے یاوہ گوئی کرتے رہے۔ اب جبکہ حساب کی گھڑی آن پہنچی ہے تو اب ان کے ایمان لانے کا کیا فائدہ؟

آیت ۵۴ ﴿وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ ''اور آڑ کر دی جائے گی ان کے اور ان کی مَن پسند چیزوں کے مابین''

مَا يَشْتَهُوْنَ سے مراد جنت اور جنت کی نعمتیں ہیں۔ سورۂ قٓ' آیت ۳۵ میں اہلِ جنت کے لیے ان نعمتوں کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا﴾ ''ان کے لیے اس میں ہوگا جو وہ چاہیں گے''۔ یعنی جو جو چیزیں انسان کو مرغوب ہوتی ہیں وہ اہل جنت کو جنت میں فراہم کی جائیں گی۔ جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۳۱ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾ ''اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہوگا جس کی خواہش تمہارے جی کریں گے''۔ جبکہ مجرموں کو اس دن ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے گا۔

﴿كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''جیسا کہ اس سے پہلے ان جیسا طرزِ عمل اختیار کرنے والے لوگوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔''

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝۵۴﴾ ''وہ لوگ بھی (ایسے ہی) اضطراب والے شک میں پڑے رہے تھے۔''

ان لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں شکوک وشبہات جنم لیتے رہے اور اسی طرح انہیں بھی حق کی تصدیق کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

قرآن اور رمضان

جمیل الرحمٰن عباسی

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ‘ رمضان شریف کی آمد پر اپنے صحابہ کو اس کی بشارت دیا کرتے تھے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لِاَصْحَابِہٖ یُبَشِّرُھُمْ :((قَدْ جَاءَ کُمْ رَمَضَانُ شَھْرٌ مُبَارَکٌ.....)) (مسند احمد)

’’کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو خوشخبری سناتے ہوئے فرمایا: ’’تمہارے پاس رمضان آ گیا ہے‘ جو ایک برکت والا مہینہ ہے.....‘‘

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا آخر شعبان کا خطبہ بھی معروف ہے۔ تو اس سنت کی پیروی میں رمضان کی فضیلت و خیریت اور اس کے متعلقہ چند امور کا تذکرہ پیش نظر ہے تا کہ تذکیر کا سامان ہو سکے۔

رمضان المبارک‘ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے اور قرآن و رمضان کا باہم خصوصی تعلق ہے۔ گویا یہ قرآن سے عبارت ہے‘ قرآن سے بنا ہے۔ لیکن قرآن پر بات کرنے سے پہلے رمضان المبارک کی عمومی فضیلت کا بیان بھی ضروری ہے۔

اہمیت وفضیلتِ رمضان

اسلام کی بنیاد جن اُمور پر رکھی گئی ہے ان میں ایک ماہِ رمضان کے روزے رکھنا بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

☆ jmrabbasi@gmail.com

’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں‘ اور نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ ادا کرنے پر‘ حج کی ادائی پر اور ماہ رمضان کے روزے رکھنے پر۔‘‘

ماہِ رمضان کی ایک خاص فضیلت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا کَانَ أَوَّلُ لَیْلَۃٍ مِنْ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَمَرَدَۃُ الْجِنِّ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ، فَلَمْ یُفْتَحْ مِنْھَا بَابٌ، وَفُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجِنَانِ، فَلَمْ یُغْلَقْ مِنْھَا بَابٌ، وَنَادٰی مُنَادٍ: یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ، وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ، وَلِلّٰہِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ، وَذٰلِکَ عِنْدَ کُلِّ لَیْلَۃٍ (سنن الترمذی و سنن ابن ماجه)

’’جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن قید کر دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا‘ اور جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رکھا جاتا۔ اور ایک آواز لگانے والا آواز لگاتا ہے: اے خیر کے چاہنے والے آگے بڑھ اور اے شر کے چاہنے والے پیچھے ہٹ! اور اللہ کی جانب سے بہت سارے لوگ دوزخ سے بچائے جاتے ہیں۔ اور یہ ہر رات ہوتا ہے۔‘‘

اس حدیث میں جو شیاطین کے قید کر دیے جانے‘ دوزخ کے دروازے کھول دیے جانے اور ابوابِ جہنم کے بند کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے‘ قاضی عیاض رحمہ اللہ اس کی مراد بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

’’اس کا احتمال ہے کہ یہ حقیقت کا بیان ہو یعنی فی الواقع جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہوں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہوں۔ اور ماہِ رمضان میں فرشتوں کی بکثرت آمد رہتی ہو‘ ان کے اثرات کی وجہ سے شیاطین بھاگ جاتے ہوں اور مسلمانوں کو گمراہ نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی امکان ہے کہ یہ بیان مجاز ہو یعنی جنت کے دروازوں کا کھولنا اور دوزخ کے دروازوں کا بند کرنا‘ کثرتِ ثواب اور کثرتِ مغفرت اور کثرتِ اسباب دخولِ جنت کی طرف اشارہ ہو اور شیطانوں کی قید سے مراد ان کا تضلیل واغوا اور وسوسہ اندازی سے عاجز ہو جانا ہو‘ تو گویا انہیں قید ہی کر دیا گیا ہو‘ اور اس صورت میں شیطانوں کی یہ بندش بعض چیزوں سے ہو اور بعض سے نہ ہو‘ اور بعض

اشخاص پر ان کی بندش کی جائے اور بعض پر نہ کی جائے۔‘‘

شارحینِ حدیث میں سے کئی ایک نے ان امور کو ظاہر پر محمول کیا ہے حتیٰ کہ ابن منیر نے لکھا کہ ان الفاظ کو ظاہر اور حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت میں بیان فرماتے ہیں:

’’شیاطین کے قید کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شیطان رمضان کے علاوہ کے دنوں میں لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرتے ہیں رمضان میں اس طرح نہیں کر سکتے‘ اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ مسلمان روزے کا اہتمام کرتے ہیں جو شہوات کے زور کو توڑتا ہے‘ اسی طرح تلاوتِ قرآن اور دیگر عبادتوں سے اشتغال رکھنا شیطان سے محفوظ بناتا ہے۔‘‘

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’صحیح یہ ہے کہ اس بیان کو حقیقت پر محمول کیا جائے تب معنی یوں ہوں گے کہ رمضان میں فوت ہو جانے والے اشخاص کے لیے جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور جنت سجائی جاتی ہے‘ اور یہ رمضان میں کی جانے والی عبادت کی فضیلت کی وجہ سے ہے‘ اور جو (مسلم) شخص رمضان میں فوت ہو جائے اسے دوزخ میں نہیں ڈالا جاتا‘ اور شیاطین کو بھی فی الواقع قید کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ روزے دار کے روزے میں خلل نہ ڈالیں۔‘‘ (فتح الباری)

اس تشریح پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں تو پھر رمضان میں گناہ کیوں صادر ہوتے ہیں؟ امام قرطبیؒ نے اس اشکال کے متعدد جواب دیے ہیں‘ مثلاً یہ کہ شیاطین سے کل شیاطین مراد نہیں ہیں بلکہ سرکش شیاطین مراد ہیں‘ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ پس چھوٹے شیاطین‘ شیاطین انس اور لوگوں کی شہوات اور نفسانی خواہشات کے سبب گناہ وجود میں آتے ہیں۔ بعض علماء نے قید کیے جانے کا اطلاق صرف بڑے سرکش شیاطین پر کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ چھوٹے شیطان کھلے رہتے ہیں۔ بندۂ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مقام پر آ کر‘ حقیقت اور مجاز دونوں قسم کی آراء جمع ہو جاتی ہیں‘ وہ اس طرح کہ بڑے شیاطین کی قید تو حقیقی ہے جبکہ چھوٹے شیطانوں کی قید مجازی ہے‘ یعنی وہ ہیں تو کھلے لیکن نقصان نہیں پہنچا سکیں گے‘ اور ان کی قید کا انحصار لوگوں کے روزے‘ اس کے آداب اور دیگر عبادات کے اہتمام پر ہے۔ یہ حفاظت انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو رمضان کا حق ادا کریں گے۔

رمضان کی عمومی برکات

مندرجہ بالا برکات ان معنوں میں خاص ہیں کہ بیان کردہ توجیہات کے مطابق یہ برکات رمضان کی محنت کرنے والوں کو ملیں گی۔ لیکن رمضان اور روزے کی عمومی برکات‘ چاہے کم تر ہی سہی ہر مسلمان کو ملتی ہیں۔ اور اسی کے زیر اثر بعض مسلمانوں کے گناہوں میں کمی آ جاتی ہے یا ہلکی پھلکی نیکی وہ بھی کرنے لگتے ہیں اور ان کی یہ حالت غیر رمضان سے کسی قدر بہتر ہوتی ہے۔ گویا رمضان کی برکات سے بالکل محروم یہ بھی نہیں رہے۔ ان لوگوں کو یہ ’’چند کلیوں‘‘ کا حصہ ایک تو سرکش شیاطین کی قید کی وجہ سے نصیب ہوتا ہے جبکہ دوسری وجہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی توجیہات سے معلوم ہوتی ہے‘ فرماتے ہیں:

’’جان لو کہ یہ فضیلت مسلمانوں کو ملتی ہے کافروں کو نہیں‘ بلکہ وہ تو رمضان میں شعائر اللہ کی ہتک کے سبب بھی اندھے اور گمراہ ہی رہتے ہیں‘ لیکن جب مسلمان روزہ رکھتے ہیں اور قیام کرتے ہیں تو انوار کے سمندروں میں غوطہ زنی کرتے ہیں اور ان کی دعائیں دوسروں کو بھی گھیرے میں لے لیتی ہیں اور ان کے انوار کا عکس دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور ان کی برکتیں پوری جماعت پر چھا جاتی ہیں۔ پھر ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق منجیات کا اہتمام کرتا ہے اور مہلکات سے دور بھاگتا ہے۔ اس طرح جنت کے دروازے کھلنے اور دوزخ کے دروازے بند ہونے والی بات ان سب کے لیے پوری ہو جاتی ہے۔‘‘

یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ عمومی برکات‘ خصوصی برکات کے مقابلے میں بہت ہی معمولی ہیں۔ ہمیں کوشش کر کے خصوصی برکات میں سے حصہ لینا چاہیے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پہ قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا!

رمضان بطورِ کفّارہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ، اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِر)) (صحیح مُسلم)

''پانچ نمازیں' جمعہ اگلے جمعے تک' اور رمضان اگلے رمضان تک کے (چھوٹے) گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے' جبکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔''

معاف ہونے والے گناہوں سے صغائر مراد ہیں نہ کہ کبائر' اور وہ بھی ایسے صغائر جن پر انسان اصرار نہ کرتا ہو' بلکہ کبھی کبھی سرزد ہو جاتے ہوں۔ امام بلقینیؒ فرماتے ہیں:

''انسان جو صغیرہ گناہ بلا اصرار کرتا ہو تو یہ گناہ اس سے معاف کر دیے جاتے ہیں' لیکن اگر باصرار کیے جائیں تو معاف نہ ہوں گے' کیونکہ صغیرہ پر اصرار اسے کبیرہ بنا دیتا ہے۔'' (فتح الباری)

رمضان کے کفارہ ہونے اور اس میں مغفرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رمضان میں فرشتے اہلِ ایمان کے لیے خصوصی استغفار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے امت کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

((أُعْطِيَتْ أُمَّتِي فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ خَمْسَ خِصَالٍ لَمْ تُعْطَهَا أُمَّةٌ قَبْلَهُمْ: خُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ، وَتَسْتَغْفِرُ لَهُمُ الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى يُفْطِرُوْا، وَيُزَيِّنُ اللّٰهُ كُلَّ يَوْمٍ جَنَّتَهُ ثُمَّ يَقُوْلُ: يُوْشِكُ عِبَادِيَ الصَّائِمُوْنَ أَنْ تُلْقَى عَنْهُمُ الْمُؤْنَةُ وَالْأَذٰى وَيَصِيْرُوْنَ إِلَيْكِ))

(مسند أحمد)

''میری اُمت کو رمضان میں پانچ چیزیں ایسی دی گئیں جو ان سے پہلے کسی اُمت کو نہیں دی گئیں۔ ان کے روزے دار کے منہ کی بُو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ جب وہ روزے سے ہوتے ہیں تو افطار تک ان کے لیے فرشتے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر دن جنت کو سجاتا ہے اور اس سے فرماتا ہے: میرے روزے دار بندوں کو مشقت اور تنگی پہنچی ہوگی اور وہ تمہاری طرف آئیں گے۔''

ایمان واحتساب کی ضرورت

رمضان المبارک کا کفارہ اور ذریعۂ مغفرت ہونا' ایمان واحتساب کے ساتھ مشروط ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـــهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـــهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ

اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (متفق علیه' بحواله مشکاة المصابیح' کتاب الصوم)

''جس نے رمضان کے روزے ایمان واحتساب کے ساتھ رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔ اور جس نے رمضان کی راتوں کا قیام' ایمان واحتساب کے ساتھ کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔ اور جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ شب قدر کا قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔''

ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فَرَضَ صِيَامَ رَمَضَانَ عَلَيْكُمْ، وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهُ، فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) (سنن النسائی)

''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے تمہارے لیے اس کی راتوں کے قیام کو سنت قرار دیا۔ پس جو اس مہینے کے صیام وقیام کا اہتمام ایمان واحتساب کے ساتھ کرے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے اس کی ماں نے اسے (گناہوں سے پاک) جنا تھا۔''

احتساب کا مطلب: احتساب کا تعلق نیت سے ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص انداز میں تعارفِ باب کے طور پر اسے یوں بیان فرمایا ہے:

باب مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا وَنِيَّةً وَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم يُبْعَثُوْنَ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ

امام صاحبؒ لفظِ احتساب کے ساتھ نیت کا لفظ' اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث مرفوع کے ذکر سے اس جانب اشارہ فرماتے ہیں کہ احتساب سے مراد نیت ہے۔ شارحِ بخاریؒ امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو یوں واضح کیا:

''ایمان سے مراد روزے کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا ہے اور احتساب کا معنی یہ ہے کہ روزے کا اجر وثواب صرف اللہ ہی سے طلب کیا جائے۔'' (فتح الباری)

ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ نے جو ایمان کا ذکر فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ پر ایمان و

تصدیق کا حامل ہو اور اسے یہ بھی یقین ہو کہ روزے سے وہ اللہ کا قرب حاصل کر رہا ہے' جبکہ احتساب کا مطلب یہ ہے انسان اپنے اعمال کا اجر صرف اللہ ہی سے چاہتا ہو اور اس عبادت سے اس کے پیش نظر اور کوئی مفاد نہ ہو۔'' (مرقاۃ)

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ کی شرح میں فرماتے ہیں:

''ایمان و احتساب کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ (اور روزے کی فرضیت) کی تصدیق اور ثواب کے شوق میں روزہ رکھے' دلی رضامندی سے روزہ رکھے' نہ کہ ناپسندیدگی سے' نہ تو روزے کو بوجھ سمجھے اور نہ ہی یہ کہا کرے کہ جی دن کتنے لمبے ہو گئے ہیں' بلکہ لمبے دنوں کے روزے کو غنیمت جانے کہ یہ مشقت تو روزے کے اجر کو بڑھانے والی ہے۔''

آج کل بعض لوگ احتساب کو محاسبۂ نفس اور خود احتسابی کے معنی میں سمجھتے ہیں' لیکن درحقیقت احتساب محاسبۂ نفس سے بہت بلند ایک کیفیت ہے جس کا بیان ایمان و احتساب کے ناموں سے ہوا۔

برکاتِ رمضان

رمضان المبارک کو رسول اللہ ﷺ نے شہر مبارک قرار دیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَتَاكُمْ رَمَضَانُ شَهْرٌ مُبَارَكٌ، فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ، تُفْتَحُ فِيهِ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَتُغْلَقُ فِيهِ أَبْوَابُ الْجَحِيمِ، وَتُغَلُّ فِيهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِينِ، لِلّٰهِ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ، مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ))

(مسند احمد و سنن النسائی)

''تم پر رمضان کا مہینہ آ گیا ہے جو ماہِ مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے رکھنا تم پر فرض قرار دیا ہے۔ اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ سرکش شیطانوں کو بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے' اور جو کوئی اس کے خیر سے محروم رہا وہ ہے ہی محروم۔''

اس مہینے کے مبارک ہونے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس مہینے میں نیکی کرنا آسان ہو جاتا ہے' جو کہ شیاطین کی بندش' نفس کے منہ زور گھوڑے کی لگام

ڈلوائی وغیرہ کے سبب ہوتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے ماہِ رمضان کو اہل ایمان کے لیے بہترین قرار دیا اور اس کی وجہ یوں بیان فرمائی:

((وَذٰلِكَ لِمَا يُعِدُّ الْمُؤْمِنُوْنَ فِيهِ مِنَ الْقُوَّةِ لِلْعِبَادَةِ ..... هُوَ غُنْمُ الْمُؤْمِنِ.....)) (مسند احمد)

''یہ اس لیے ہے کہ مؤمن کو اس مہینے میں عبادت کی خاص قوت عطا کی جاتی ہے..... اور یہ مؤمن کے لیے مالِ غنیمت ہتھیانے کا موقع ہے۔''

شہر مبارک ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس میں نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً)) (سنن الترمذی)

''رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔''

ابن الملقنؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''رمضان کے عمرے کی حج سے برابری کا مطلب' ثواب میں برابری ہے (نہ کہ ادائیگی فرض میں) اور مراد حج نفلی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی فضیلت و شرف میں اضافے یا خلوصِ نیت اور حضورِ قلبی کے اضافے سے اعمال کا ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ ابن شہاب الزہریؒ فرماتے ہیں کہ رمضان میں ایک بار سبحان اللہ کہنا غیر رمضان میں ستر بار تسبیح کرنے سے افضل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ رمضان کی برکت سے اجر و ثواب میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔'' (التوضیح لشرح الجامع الصحیح)

امام ترمذی نے ایک روایت بیان کی ہے' اگرچہ اس کی سند کو کمزور قرار دیا ہے' جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ ''افضل صدقہ کون سا ہے؟'' فرمایا: ((صَدَقَةٌ فِي رَمَضَانَ)) ''رمضان میں صدقہ کرنا۔'' (سنن ترمذی)

علامہ نور الدین العزیزی' السراج المنیر شرح جامع الصغیر میں اس روایت کے تحت لکھتے ہیں: ''رمضان کے صدقے کی فضیلت اس لیے بھی ہے کہ یہ نیکیوں اور عبادات کا مہینہ ہے' اسی لیے رسول اللہ ﷺ رمضان میں زیادہ سخاوت فرمایا کرتے تھے۔''

علامہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرحال اس روایت کی کمزوری کے باوجود دیگر نصوص اور اُسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے رمضان میں صدقے کا مستحب ہونا ثابت ہے۔ بلکہ یہ عاجز

تو یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ روایت سرے سے موجود نہ ہوتی تو بھی نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل ہی رمضان میں انفاق وصدقات کے استحباب کے ثبوت کو کافی تھا اور امت کے صالحین کا طرزِ عمل بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''میں لوگوں کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے سخاوت کا مظاہرہ کریں۔''

ایک حدیث نبویؐ میں یہ مضمون یوں بھی منقول ہے:

((مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ، كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فِيْهِ فَرِيْضَةً كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ))

(صحيح ابن خزيمه)

''جس نے اس مہینے میں کسی (نفل) نیکی سے اللہ کا تقرب حاصل کیا وہ ایسے ہے گویا اس نے غیر رمضان میں فرض ادا کیا' اور جس نے رمضان میں فرض ادا کیا گویا اس نے غیر رمضان میں ستر فرض ادا کیے۔''

حاصل یہ ہے کہ رمضان میں نیکیوں کا اجر بڑھا دینا بھی اس کی برکت کی ایک نشانی ہے۔

اجتہاد فی الخیرات

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رمضان کی آمد پر نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَتَاكُمْ رَمَضَانُ شَهْرُ بَرَكَةٍ، فِيْهِ خَيْرٌ يُغَشِّيْكُمُ اللّٰهُ (فِيْهِ)، فَتَنْزِلُ الرَّحْمَةَ، وَتُحَطُّ الْخَطَايَا، وَيُسْتَجَابُ فِيْهِ الدُّعَاءُ، فَيَنْظُرُ اللّٰهُ إِلٰى تَنَافُسِكُمْ، وَيُبَاهِي بِكُمْ مَلَائِكَتَهُ، فَأَرُوا اللّٰهَ مِنْ أَنْفُسِكُمْ خَيْرًا، فَإِنَّ الشَّقِيَّ مَنْ حُرِمَ فِيْهِ رَحْمَةَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) (رواه الطبراني في مسند الشاميين)

''تم پر برکت والا مہینہ رمضان آ رہا ہے۔ اس میں اللہ تمہیں نیکی سے ڈھانپ لیتا ہے اور اس کی رحمت نازل ہوتی ہے اور خطائیں معاف کی جاتی ہیں اور دعائیں سنی جاتی ہیں۔ پس اللہ تمہارے تنافس (نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش) کو دیکھتا ہے اور فرشتوں پر تمہارے ذریعے فخر جتلاتا ہے۔ پس اللہ کو اپنی طرف سے

نیکی دکھاؤ۔ پس بڑا بد بخت ہے وہ جو اس ماہ مقدس میں اللہ کی رحمت سے محروم رہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینے میں نہ صرف یہ کہ نیکیوں کی کثرت کرنا چاہیے بلکہ اس میں تنافس (مقابلے) سے کام لیتے ہوئے نیکیوں میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: فَأَيُّ الصَّائِمِيْنَ أَعْظَمُ أَجْرًا ''روزہ داروں میں زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟'' فرمایا: ((أَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى ذِكْرًا)) ''ان میں سے اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والا۔'' (مسند احمد)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ رکھ کر ذکر میں کثرت کرنا چاہیے اور یہ کہ ذکر سے روزے کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ اس مہینے حتی الامکان' نیک اعمال اور تبتل الی اللہ میں خوب محنت کیا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ، وَكَثُرَتْ صَلَاتُهُ، وَابْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ، وَأَشْفَقَ مِنْهُ (شعب الإيمان)

''جب رمضان داخل ہو جاتا تو آپ ﷺ کا رنگ بدل جاتا' آپؐ کی نمازیں زیادہ ہو جاتیں اور دُعا میں آہ وزاری کرتے اور اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرا کرتے۔''

قرآن اور رمضان

رمضان کی عظمت وفضیلت کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس مہینے میں نیکیوں میں کثرت کرنا چاہیے۔ اب ہمارے پیش نظر رمضان اور قرآن کے باہمی تعلق کو بیان کرنا ہے۔ روزے اور قرآن کا گہرا تعلق ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ رمضان قرآن کا مہینہ خاص ہے اور قرآن رمضان کا وظیفہ خاص ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرة: ١٨٥)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں واضح نشانیاں ہیں ہدایت کی اور یہ حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔''

امام ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے رمضان اور قرآن کے تعلق کو بہت ہی خوبصورت جملے

میں بیان کیا ہے: ''پس رمضان قرآن کے لیے بمنزلہ ظرف ہے' یکبارگی انزال کے حوالے سے بھی اور تفصیلی نزول کے اعتبار سے بھی اور دورۂ قرآنی کے اعتبار سے بھی۔''

امام ابن حجرؒ نے رمضان کے قرآن کا ظرف ہونے کو تین اطراف سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں انہیں الگ الگ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظرفِ انزال: اس کا معنی یہ ہے کہ رمضان کا یکبارگی نزول رمضان المبارک میں ہوا۔ اس نازل ہونے کی طرف اشارہ آیۂ مبارکہ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ میں کیا گیا ہے۔

امام ابن کثیرؒ سورۃ القدر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے حضرات کا یہ قول نقل فرماتے ہیں: ''اللہ نے کُل قرآن ایک ہی بار لوحِ محفوظ سے بیت العزّت میں منتقل کر دیا جو آسمان دنیا پر ہے' پھر تھوڑا تھوڑا کر کے' حسب حالات نبی کریم ﷺ پر تیئس سال میں نازل کیا جاتا رہا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال کی روشنی میں قرآن کا نزولِ اوّل' جو یکبارگی ہوا' یہ لوحِ محفوظ سے بیت العزت تک کا نزول ہے۔ یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا' جو رمضان ہی کی ایک رات ہے۔ اور اس رات کی فضیلت کی وجہ بھی یہی نزولِ قرآن ہی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے قیام کے ساتھ لیلۃ القدر کے قیام کا بھی نام لے کر ذکر فرمایا۔

ظرفِ تنزیل: مشرکین نے جب نبی اکرم ﷺ کی رسالت پر اعتراضات کیے تو ایک اعتراض یہ بھی تھا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝۳۲﴾ (الفرقان)

''اور کافروں نے کہا کہ کیوں ان پر پورا قرآن ایک ہی بار نازل نہیں کیا جاتا؟ اسی طرح (ہم تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرتے ہیں) تاکہ آپ کے دل کو ثبات دیں اور اس کو پڑھ دیں تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

اس آیت میں لفظ ''جُمْلَةً'' استعمال کیا گیا جو پورے کے معنی میں آتا ہے' یعنی ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ کلام اللہ کا ہے تو وہ آہستہ آہستہ کیوں اُتارتا ہے؟ کیا یکبارگی اتارنا اس کے لیے مشکل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہم اسی طرح نازل کرتے ہیں' یعنی ہمارا کلام

ہے' اسے ہم اپنی ترتیب کے مطابق ہی نازل کریں گے۔ پھر اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ آپ ﷺ کے ثباتِ قلبی کے لیے ہے۔

''جُمْلَةً'' کا متضاد ''تَفْصِيلًا'' ہے جو فصل سے ہے' یعنی الگ الگ اور تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا۔ اسی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کا مفہوم درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝۱۰۶﴾ (بنی اسرائیل)

''اور قرآن کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے (کر کے نازل) کیا ہے' تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں۔''

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''پس قرآن لیلۃ القدر میں یکبارگی بالائی آسمانوں سے سمائے دنیا پر نازل ہوا' پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جاتا رہا۔''

قرآن پاک میں قرآن کے نازل ہونے کے لیے انزال اور تنزیل دونوں لفظ آتے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کے فرق کو سمجھنے کے لیے سیدنا ابن عباسؓ کے اقوال پر غور کیجیے۔ آپؓ نے یک بارگی نزول کے لیے اُنْزِلَ کا صیغہ استعمال فرمایا اور تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے کے لیے تنزیل سے نَزَّلَ کا صیغہ استعمال فرمایا۔

ایک دوسری روایت میں ابن عباسؓ اس کی کچھ تفصیل فرماتے ہیں:

''قرآن یک بارگی اللہ تعالیٰ کے پاس سے یعنی لوحِ محفوظ میں سے آسمانِ دنیا پر معزز لکھنے والے فرشتوں کے حوالے کیا گیا۔ ان فرشتوں نے بیس راتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اس قرآن کو جبریل تک پہنچایا اور جبریل نے تھوڑا تھوڑا کر کے بیس سال میں قرآن کو نبی اکرم ﷺ پر نازل کیا۔'' (تفسیر ابن کثیر)

قرآن مجید کا بطرزِ تنزیل' تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا جانا بہ واسطہ جبریل رسول اللہ ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہوا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۹۷﴾ (البقرۃ)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے جو کوئی بھی دشمن ہو جبرائیلؑ کا تو (وہ یہ جان لے کہ)

اُس نے تو نازل کیا ہے اس قرآن کو آپؐ کے دل پر اللہ کے حکم سے ۔ یہ تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اس کلام کی جو اس کے سامنے موجود ہے ۔ اور ہدایت اور بشارت ہے اہل ایمان کے لیے۔''

اس نزول کی ابتدا غارِ حرا سے ہوئی اور یہ ابتدائے نزول بھی رمضان میں ہوا‘ جیسا کہ امام ابن حجر عسقلانیؒ رمضان میں نبی اکرمﷺ اور جبریل علیہ السلام کے دورۂ قرآنی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس میں اشارہ ہے کہ ابتدائے نزولِ قرآن رمضان مبارک ہی میں ہوئی‘ اس لیے کہ لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا پر یکبارگی نزول بھی رمضان میں ہوا تھا‘ جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث سے ثابت ہے اور نبی اکرمﷺ اور جبریل کا تکرارِ باہمی بھی رمضان سے رمضان ہوا کرتا تھا۔'' (فتح الباری)

یہ امر کہ نبی اکرمﷺ پر نزولِ قرآنی کی ابتدا رمضان میں ہوئی‘ احادیث میں اشارتاً ہی بیان ہوا ہے‘ لیکن اگر ہم سیرت کی کتابوں کی طرف رجوع کریں تو قدرے صراحت کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے کہ غارِ حرا میں ابتدائے نزول رمضان ہی میں ہوا۔ اس لیے کہ سیرت کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ نبوت سے پہلے غارِ حرا کی خلوت گزینی ہر سال ماہِ رمضان ہی میں ہوا کرتی تھی‘ جیسا کہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: ''آپﷺ کی خلوت کی مدت معلوم ہے اور وہ ایک ماہ ہوا کرتی تھی اور مہینہ رمضان کا ہوا کرتا تھا۔'' (عمدة القاری شرح صحیح البخاری)

عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ ''رسول اللہﷺ ہر سال ایک مہینے کے لیے غارِ حرا میں خلوت اختیار فرمایا کرتے تھے اور غارِ حرا میں جانا ایامِ جاہلیت میں قریش (کے حُنفاء) کا طریقہ عبادت تھا۔'' (السيرة النبويه لابن هشام)

بخاری شریف میں ''بَابُ كَيْفَ كَانَ بدء الوحي إلى رسول اللهﷺ'' کی ایک روایت سے ثابت ہے کہ غارِ حرا ہی کی خلوت کے دوران آپﷺ پر وحی کا آغاز ہوا۔ سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

''پھر آپﷺ کو خلوت محبوب بنا دی گئی اور آپؐ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور تحنث فرماتے ۔ تحنث سے مراد عبادت ہے ۔ آپؐ کئی راتیں ادھر ہی رہتے اور جب سامانِ خورد و نوش ختم ہو جاتا تو گھر والوں کے پاس آتے ۔ اور سیدہ خدیجہؓ مزید

توشہ تیار فرما دیتیں ۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ آپؐ ادھر ہی تھے کہ آپؐ پر حق نازل ہوا اور فرشتہ آپؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اِقْرَأْ''۔

یہی بات سیرت ابن ہشام میں صراحت کے ساتھ آئی ہے:

''پھر آپؐ کے پاس جبریلؑ اللہ کی طرف سے دی گئی کرامت اور بزرگی (یعنی) نبوت لے کر آئے جبکہ آپﷺ رمضان کے مہینے میں غارِ حرا میں خلوت نشیں تھے۔''

ابن کثیرؒ نے اپنی سیرت میں ایک دوسری سند سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''یہاں تک کہ وہ مہینہ آ گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خاص کرامت سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ یہ آپؐ کا سالِ بعثت تھا اور یہ رمضان کا مہینہ تھا۔''

اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ نبی اکرمﷺ پر نزولِ قرآن کی ابتدا رمضان میں ہوئی۔ یہ رمضان کی عظمت اور رمضان و قرآن کے باہمی تعلق کی ایک دوسری جہت ہے۔

ظرفِ عرض: رمضان کے قرآن کے لیے ظرف ہونے کا تیسرا پہلو ''عَرْضًا'' ہے۔ عرض کا سادہ سا مطلب پیش کرنا ہے اور اصطلاحِ محدثین میں عرض کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے شیخ کے سامنے قراءت کرے تاکہ شیخ یا تو اس کی اصلاح کر دے یا تصدیق کر دے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمﷺ جبریل امین علیہ السلام کے سامنے قرآن مجید کے ساتھ ہر رمضان میں یہ عمل کرتے تھے:

إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، كَانَ يَعْرِضُ الْقُرْآنَ عَلٰى جِبْرِيْلَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً، فَلَمَّا كَانَ فِي الْعَامِ الَّذِي قُبِضَ فِيهِ عَرَضَهُ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ (مسند احمد ومستدرك حاكم و قال الصحيح و اقره الذهبي)

''بے شک رسول اللہﷺ ہر سال ایک بار جبریل پر قرآن پیش کیا کرتے تھے اور جس سال آپؐ کو اس دُنیا سے اٹھایا گیا اس سال آپﷺ نے دو مرتبہ قرآن ان پر پیش کیا۔''

اس روایت میں عرض یعنی پیش کرنے کا فاعل نبی اکرمﷺ کو بتایا گیا ہے‘ جبکہ ایک دوسری روایت میں عرض کا فاعل جبریل علیہ السلام کو بتایا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ:

كَانَ يَعْرِضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ الْقُرْآنَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً، فَعَرَضَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ فِي الْعَامِ الَّذِي قُبِضَ (صحيح البخاري)

''(جبریل علیہ السلام) نبی اکرمﷺ پر قرآن ہر سال ایک دفعہ پیش کیا کرتے تھے۔ پس جس

سال آپؐ کو دُنیا سے اٹھایا گیا اس سال دو دفعہ آپ ﷺ پر قرآن پیش کیا گیا۔''

پہلی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ جبریل علیہ السلام پر قرآن پیش کیا کرتے تھے' تاکہ جبریل علیہ السلام بحکم خداوندی آپؐ کی اصلاح فرمادیں' جبکہ دوسری روایت کے مطابق جبریلؑ نبی اکرم ﷺ پر قرآن پڑھا یعنی پیش کیا کرتے تھے تاکہ آپؐ ان سے سن کر اصلاح وحفظ کرلیں۔ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہستیاں ایک دوسرے پر قرآن پیش کیا کرتی تھیں۔

اس مفہوم کی مزید تائید ایک تیسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں عرض کے بجائے معارضہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں دوطرفہ عرض' یعنی ایک دوسرے پر پیش کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ معارضہ (قرآن کا دور) کیا کرتے تھے اور سالِ وصال میں آپ ﷺ کو دو بار دور کرایا گیا۔''

امام ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ''ان روایات کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ یہ دونوں بزرگ ہستیاں ایک دوسرے پر قرآن پڑھا کرتی تھیں۔'' (فتح الباری)

ملّا علی القاریؒ نے ''مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح'' میں اس بات کو قدرے تفصیلی سے یوں بیان کیا ہے:

> ''دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے جو بات بالکل ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور پیش کرنا' نبی اکرم ﷺ اور جبریل علیہ السلام دونوں کے درمیان تھا۔یعنی ایک دفعہ آپ ﷺ پڑھا کرتے تھے اور ایک دفعہ جبریل علیہ السلام پڑھا کرتے تھے۔مزید تفصیل میں جائیں تو زیادہ احتمال یہ ہے کہ پہلے جبریل علیہ السلام قرآن میں سے کچھ حصہ تلاوت فرمایا کرتے تھے' پھر نبی اکرم ﷺ اس حصے کو اسی طرح دہرایا کرتے تھے تاکہ ضبط وترتیب اور حفظ میں مزید اعتماد اور پختگی حاصل ہو جائے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان دونوں میں ایک مثلاً دس آیات پڑھا کرتے تھے اور پھر انہی آیات کو دوسرا پڑھا کرتا تھا۔یہ بھی تکرار اور مدارست باہمی ہے جو قرائے کرام میں معروف ہے۔''

معارضہ قرآنی کی برکات

یہاں تک تو عرض قرآنی کی ظاہری صورت کا بیان مکمل ہوا۔اب اس قرآنی دورے کی کیا برکات وسعادات تھیں جن سے نبی کریم ﷺ بہرہ ور ہوئے' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے دیکھتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ ، وَكَانَ أَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ ، وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ ، فَلَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ) (صحيح البخاری)

''رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی اور فیاض تھے۔رمضان میں جب کہ جبریل علیہ السلام آپؐ سے ملاقات کیا کرتے آپ ﷺ کی سخاوت عروج پر ہوتی' اور جبریل رمضان کی ہر رات میں آپ ﷺ سے ملاقات کیا کرتے اور آپؐ کو قرآن کا دورہ کروایا کرتے۔پس رسول اللہ ﷺ نیکی کا فیض عام کرنے میں چلتی ہوا سے زیادہ تیز ہوجایا کرتے تھے۔''

امام ابن حجرؒ نے قرار دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس سخاوت کا سبب جبریل علیہ السلام سے ملاقات تھی۔ایک دوسرے مقام پر امام نے اس بات کے ساتھ کچھ دیگر لطیف حقائق اور تلاوت اور مذاکرۂ قرآنی کی برکت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

''اس (معارضہ قرآن والی) حدیث میں کچھ اضافی معنی بھی ہیں۔اس میں رمضان کی عظمت وتعظیم کا بیان ہے' کیونکہ قرآن کے نزول کی ابتدا اسی سے کی گئی اور نازل شدہ قرآن کے مذاکرے اور معارضے کے لیے بھی اسی مہینے کو پسند کیا گیا۔اسی کا لازمی نتیجہ تھا کہ جبریلؑ کثرت کے ساتھ آتے تھے اور ان کی آمد ایسی نیکیاں اور برکات ساتھ لاتی تھی جنہیں شمار بھی کرنا ممکن نہیں ہے۔اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کسی فضیلت والے وقت کی فضیلت میں سے حصہ لینے کا طریقہ اس وقت میں زیادہ سے زیادہ عبادت ہی ہے۔اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت پر دوام اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ نیکی میں آگے بڑھنا ہے۔اور اس حدیث سے آخری عمر میں عبادت کی کثرت کا اہتمام کرنے کا پسندیدہ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے (کیونکہ آخری سال آپ ﷺ کو دورۂ قرآنی دو بار کرایا گیا)۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے نیکی اور علم میں پختہ لوگوں سے مذاکرہ علمی جاری رکھنا چاہیے' اگرچہ مذاکرہ کرنے والے کو وہ علم سب کچھ معلوم ہو' کیونکہ اس سے یاددہانی اور علم میں رسوخ وپختگی پیدا ہوتی ہے اور اس حدیث سے رمضان کی راتوں کا اپنے دن سے افضل ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ تلاوت اور معارضہ قرآنی سے مقصود بارگاہ حق میں حضوری کی کیفیت اور قرآن کا فہم

حاصل کرنا ہے۔اسی لیے اس کام کے لیے رات کا انتخاب کیا گیا جو حضوری وفہم وسمجھداری میں معاون ہے۔کیونکہ دن کے اوقات میں دیگر دینی اور دنیوی مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کیفیات حاصل ہونا مشکل ہوتا ہے‘اس لیے دن سے اجتناب کیا گیا۔‘‘(فتح الباری)

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

’’اس حدیث سے عمومی طور پر سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے اور رمضان اور نیک لوگوں کی پہلو نشینی سے اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔اس حدیث میں صُلحاء واتقیاء اور نیک لوگوں کی بار بار زیارت کرنے کی تعلیم ملتی ہے بشرطیکہ ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرتا ہو۔اس حدیث سے رمضان میں تلاوت کی کثرت کرنے کی ترغیب ملتی ہے اور اس لیے بھی کہ تلاوت قرآن تمام اذکارِ(مجردہ) سے افضل ہے۔‘‘ (فتح الباری)

حافظ ابن رجب الحنبلیؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’’یہ حدیث رمضان میں قرآن کے پڑھنے پڑھانے یا سننے سنانے اور اس نوعیت کے اجتماعات کے مستحب ہونے پر دلیل ہے۔نیز اس حدیث سے راہنمائی ملتی ہے کہ اپنے سے زیادہ قرآن کے حفظ کے حامل لوگوں کے سامنے اپنا قرآن بغرضِ اصلاح پیش کرنا چاہیے اور اس حدیث سے رمضان میں بکثرت تلاوت کرنے کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔‘‘(لطائف المعارف)

پس اگر ہم رمضان اور قرآن کے اس تعلق کو سمجھ کر اس سے اپنا تعلق قائم کریں یعنی دونوں کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو اس عظیم بشارت کے مستحق ثابت ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے بیان کی ہے:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ، يَقُوْلُ الصِّيَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ ، وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ :مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ ، فَيُشَفَّعَانِ)) (رواه احمد والطبرانی فی الکبیر)

’’روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا)۔روزہ عرض کرے گا:اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پوری کرنے سے روکے رکھا تھا‘پس آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت ورحمت کا معاملہ فرما!)

قرآن کہے گا:میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا‘پس آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما!) چنانچہ روزے اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)۔‘‘

پس ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ رمضان میں قرآن کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرے۔اس کا ترجمہ وتفسیر پڑھنے کی کوشش کرے‘ دروسِ قرآن اور دوراتِ ترجمہ قرآنی میں شرکت کرے۔مزید یہ کہ رمضان میں انفرادی تلاوت میں اضافہ کرے‘کم از کم ایک دور تلاوت تو ضرور بالضرور مکمل کرے۔ورنہ اس سے زیادہ کی کوشش اور ارادہ کرے۔

رمضان میں اَسلاف کے قرآنی احوال

کہا جا سکتا ہے کہ رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار ہے۔لہٰذا تمام ہی نیکیوں میں سبقت کرنی چاہیے‘لیکن ان نیک اعمال میں سے ایک خاص عمل تعلق مع القرآن ہے۔رمضان میں قرآن کو خصوصیت ان دونوں کے اس باہمی تعلق کی وجہ سے حاصل ہے جو اس سے قبل بیان ہو چکا۔یہی بیان کئی محدثین نے اس انداز میں کیا:’’**استحباب الإكثار من القراءة في رمضان**‘‘(تطریز ریاض الصالحین) ’’رمضان شریف میں قرآن مجید کی تلاوت میں کثرت کرنے کا استحباب۔‘‘

اور اگر بات نیکیوں اور اجر وثواب ہی کی کریں تب بھی اس کا بہترین ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت ہے۔عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهُ بِهٖ حَسَنَةٌ ، وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا، لَا اَقُوْلُ: الٓمٓ حَرْفٌ الف حَرْفٌ وَ لَام حَرْفٌ وَ مِيْمٌ حَرْفٌ)) (سنن الترمذی)

’’جس نے اللہ کی کتاب کے ایک حرف کی تلاوت کی اس کے لیے ایک نیکی ہے اور نیکی کا اجر دس گنا دیا جاتا ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے‘ بلکہ الف ایک حرف ہے‘لام ایک حرف ہے‘میم ایک حرف ہے۔‘‘

ان دو وجوہات کی بنا پر اَسلافِ اُمت رمضان میں تلاوتِ قرآن کا خاص اہتمام کرتے رہے۔شارح بخاری‘ محدث کبیر ابن رجب الحنبلی رحمہ اللہ نے علمائے سلف کا قرآن سے

تعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''بعض علمائے سلف رمضان کے قیام میں تین دن میں قرآن ختم کرلیا کرتے تھے اور بعض لوگ سات دن میں قرآن کا دور مکمل کیا کرتے تھے‘ان میں قتادہؒ بھی تھے‘اور بعض دس دن میں قرآن کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ یہ نماز میں بھی ہوتا تھا اور غیر نماز (یعنی عام تلاوت میں بھی)۔اسودؒ تو رمضان کی دو راتوں میں قرآن کا دور مکمل کرتے تھے۔نخعیؒ آخری عشرے میں دو راتوں میں قرآن مکمل کیا کرتے اور بقیہ مہینے میں تین راتوں میں ختم کرلیا کرتے تھے۔قتادہؒ غیر رمضان میں ہمیشہ سات دنوں میں دور مکمل کرلیا کرتے لیکن رمضان میں تین دنوں میں قرآن مکمل کیا کرتے۔آخری عشرے کی راتوں میں تو ہر رات قرآن مکمل کیا کرتے تھے۔امام شافعیؒ رمضان میں قرآن حکیم کے ساٹھ دور مکمل کیا کرتے تھے اور یہ نماز کے بغیر کی تلاوت ہوتی تھی۔امام ابوحنیفہؒ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔'' (لطائف المعارف)

ابن رجب الحنبلیؒ کے مندرجہ بالا الفاظ بہت ہی اچنبھے میں ڈالنے والے ہیں اور ہمیں اندازہ ہے کہ ہم نے قارئین کرام کو حیرت سے دوچار کر دیا ہے۔لیکن محدثین کرام کی کتابوں میں ایسی روایات بکثرت موجود ہیں کہ علمائے سلف رمضان المبارک کے دوران تلاوتِ قرآن اور قیام اللیل کا غیر معمولی اہتمام کیا کرتے تھے۔

اتنی بھاری مقدارِ تلاوت کے امکان اور جواز کے بارے میں‘ان شاء اللہ‘ کچھ گفتگو آخر میں کی جائے گی‘لیکن اس سے پہلے ان کے بیان کا مقصد سمجھنا چاہیے۔سب سے پہلا مقصد تو نیکی کی رغبت حاصل کرنا ہے‘اس لیے کہ نیکی لفظی تانے بانے سے اتنی سمجھ نہیں آتی اور اس کا اتنا شوق نہیں ہوتا جتنا عملی مظاہر سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔حتیٰ کہ امام ابن جوزیؒ نے تو تزکیہ اور اصلاحِ نفس کے لیے اسلاف کی سیرتوں کے مطالعے پر بہت زور دیا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے ایک حدیث پڑھی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ نے رمضان مبارک میں تنافس فی الخیرات کا حکم دیا ہے‘اور تنافس (مقابلہ) اسی وقت پایا جاسکتا ہے جب کوئی اونچا معیار سامنے ہو۔ویسے بھی یہ اصول مسلّمہ ہے کہ دنیا کے معاملے میں نیچے والے کو اور دین کے معاملے میں اوپر والے کو دیکھا جائے تاکہ اپنی کمزوری کا احساس پیدا ہو اور انسان آگے بڑھنے کے لیے کوشاں رہے۔

ان حالات کو پڑھنے کا ایک مقصد اَسلافِ اُمت سے محبت کا حصول بھی ہے۔انس بن

مالک ؓ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام ؓ کسی معاملے پر اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے اس پر خوش ہوئے تھے کہ ایک صاحب نے سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ! ایک بندہ کسی دوسرے سے اس کے کسی نیک عمل کی وجہ سے محبت کرتا ہے لیکن خود اس کے جیسا عمل نہیں کر پا رہا (تو اس کا معاملہ کیا ہوگا)؟۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ)) (سنن اَبی داوٗد) ''بندہ اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے۔''

صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

''جو کسی قوم کے نیک اعمال کے سبب اخلاص سے محبت کرتا ہے لیکن ان جیسے عمل نہیں کرتا، تو اس قلبی تعلق کی وجہ سے وہ ان لوگوں کے زمرے میں سمجھا جائے گا‘ اور بعض اوقات یہ محبت اسے ان کے عمل تک پہنچا دیتی ہے۔اس حدیث میں صلحاء اور اہل خیر سے (جنت میں) ان سے ملنے اور دوزخ سے چھٹکارے کی امید پر محبت کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔''

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اوپر بیان کردہ بھاری بھرکم نصابات اور ان کی مزید تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہر مسلمان پر ان کی پابندی کرنی لازم قرار دے دی جائے‘ بلکہ اس تفصیل کا اتنا فائدہ‘ کہ ہم رمضان المبارک میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنے کی کوشش کریں‘ ہی کافی ہے۔عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود ؓ اپنے والد صاحب کے بارے میں بیان کرتے ہیں: ''وہ بغیر رمضان جمعے سے جمعے قرآن کی تلاوت مکمل کیا کرتے اور رمضان کے مہینے میں ہر تین دن میں قرآن کا دور مکمل کیا کرتے تھے۔'' (فضائل القرآن للقاسم بن سلام‘ حلیۃ الاولیاء)

ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ رمضان میں اپنے نصاب تلاوت کو تقریباً دوگنا سے بھی زیادہ کر دیا کرتے تھے۔پس ہم میں سے ہر ایک کی کوشش ہونی چاہیے کہ رمضان میں اپنے معمول کے نصابِ تلاوت کو کم از کم دوگنا کرنے کی کوشش کرے۔

امام شافعیؒ کے بارے میں امام ذہبیؒ لکھتے ہیں: ''ربیع بن سلیمان نے دو سندوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سندوں سے بیان کیا ہے کہ امام شافعیؒ رمضان میں قرآن کے ساٹھ دور کیا کرتے تھے۔'' (سیر اعلام النبلاء) حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء میں حضرت امامؒ کا اپنا قول نقل ہوا ہے کہ: ''میں رمضان میں ساٹھ دور قرآن مجید کے کر لیتا ہوں۔''

امام محمد بن اسماعیل البخاری ؒ کے بارے میں مسیح بن سعیدؒ روایت کرتے ہیں کہ امام

محمد بن اسماعیل البخاریؒ رمضان میں ہر دن ایک قرآن مکمل کیا کرتے تھے اور تراویح کے بعد تہجد میں قرآن پڑھا کرتے اور ہر تین دن میں ایک ختم کرلیا کرتے تھے۔''

ان روایات کو جمع کریں تو امام صاحب تراویح کی امامت میں ایک قرآن مکمل کرتے' انفرادی قیام یعنی تہجد میں ہر تین دن میں ایک ختم یعنی دس ختم کیا کرتے اور بطور تلاوت ہر دن ایک دور مکمل کیا کرتے۔ اس طرح آپ کُل چالیس یا اکتالیس دور مکمل کیا کرتے۔

امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کا رمضان میں تلاوت کا ذوق وشوق دیدنی ہوتا تھا۔ عبداللہ بن اسد روایت کرتے ہیں: ''جب رمضان شروع ہوتا تھا امامؒ خود کو تلاوتِ قرآن کے لیے فارغ کر لیتے اور جب آخری عشرہ شروع ہوتا پھر تو ہم ان کے ساتھ بات بھی نہ کر سکتے مگر بہت ہی تھوڑی!'' (الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ' عبدالقادر بن محمد القرشی الحنفی)

یہ جو الفاظ ہیں کہ ہم ان سے بات بھی نہ کر سکتے تھے ان کا حاصل یہ ہے کہ کسی خاص وقت کی فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے عام معمولات کو ترک کرنا جائز ہے اور دورانِ رمضان عبادت و تلاوت میں محنت اسی صورت کی جاسکتی ہے جب ہم اپنے میل ملاپ میں کسی قدر کمی لائیں۔ اسی اشتیاق واہتمام کا مظہر تھا کہ آپ رمضان میں قرآن کے ساٹھ تک دور مکمل کر جایا کرتے تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں امام ابن رجب الحنبلیؒ لکھتے ہیں: ''جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا تو امام مالکؒ حدیث کے پڑھنے پڑھانے اور اہل علم کی مجالست سے بچا کرتے اور مصحف سے تلاوت پر متوجہ ہو جاتے۔'' (لطائف المعارف)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ رمضان میں تمام کتابیں بند کر کے صرف قرآن کھول لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ بیان ہمیں کسی معتبر کتاب میں دستیاب نہیں ہوسکا۔ امام اسود بن یزید النخعیؒ کے بارے میں ان کے بھانجے ابراہیم النخعیؒ بیان کرتے ہیں کہ اسود بن یزید النخعی تابعیؒ رمضان میں ہر دو راتوں میں قرآن کی تکمیل کیا کرتے تھے اور وہ مغرب اور عشاء کے درمیان سویا کرتے تھے' جبکہ غیر رمضان میں وہ چھ راتوں میں قرآن کا دور مکمل کیا کرتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء)

کئی تابعین کے بارے میں مروی ہے کہ وہ رمضان میں مغرب اور عشاء کے درمیان نیند کیا کرتے تھے۔ یقیناً اس سے ان کے پیش نظر رات کے قیام میں سہولت رہتی ہوگی۔

ابراہیم النخعیؒ کے بارے میں عوام بن حوشبؒ بیان کرتے ہیں: آپؒ رمضان کے ابتدائی دنوں میں ہر تین دن میں ختم کیا کرتے تھے اور جب آخری عشرہ داخل ہوتا تو دو راتوں میں ختم کرتے اور ہر رات اچھی طرح سے غسل کیا کرتے۔'' (مصنف عبدالرزاق)

مشہور زاہد ابن عطا احمد بن محمد الادمیؒ کے بارے میں امام الذہبیؒ لکھتے ہیں: ''وہ ہر دن میں ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے اور رمضان میں نوے قرآن ختم کیا کرتے تھے' اور ان کا ایک ختم (بطریق تدبر) وہ تھا جس میں انہوں نے دس سے اوپر سال لگائے جس میں وہ غور وفکر اور تدبر فرماتے۔'' (سیر اعلام النبلاء)

امام ابن جوزیؒ نے ''صفۃ الصفوۃ'' میں بھی اس طرح کی روایات نقل کی ہیں۔ یہ روایات بتاتی ہیں کہ ان حضرات کا تلاوت کا نصاب الگ تھا اور تدبر کا نصاب الگ' اور یہ ایسا ہی انداز ہے جیسا کہ حضرت ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں امام غزالیؒ کے حوالے سے کسی عارف کا قول نقل کیا کہ ''میں ایک ختم تو قرآن مجید کا ہر جمعے کر لیتا ہوں' ایک ختم میں ماہانہ کرتا ہوں اور ایک سالانہ' اور ایک ختم اور بھی ہے جس میں میں تیس سال سے مشغول ہوں لیکن تا حال اس سے فارغ نہیں ہوسکا۔''

یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ تلاوت میں کثرت کرنے والوں کا بطریق فہم وتدبر بھی کچھ نصاب ہوتا ضرور ہے۔ اس کے بغیر وہ علم وفضل اور امامت کے اس رتبے تک نہ پہنچ پاتے۔ ہاں یہ الگ بات کہ کوئی اپنے اس نصاب کا ذکر کرتا ہے اور کوئی نہیں کرتا۔

اختلافِ ذوق

کنبے قبیلے' موسم وعلاقے اور حالاتِ زندگی اور وسائل زندگی وغیرہ کے اختلاف کا اثر انسان کے مزاج پر مرتب ہوتا ہے' جس کے زیر اثر انسان میں اختلافِ ذوق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عبادت ومجاہدے کا ظہور انسان کے ذوق کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ نفل اور تطوع کے میدان میں ایک دوسرے کے مزاج کی رعایت کرنا بہت ضروری ہے اور یہ طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھا کرتے تھے' مثلاً یوں کہ سفر میں روزہ رکھنے والے بھی ہوتے تھے اور شرعی رخصت سے فائدہ اٹھا کر افطار کرنے والے بھی ہوتے تھے' لیکن ایک دوسرے کو روکتے ٹوکتے نہیں تھے۔

اس وضاحت کے بعد ہم عرض کرتے ہیں کہ رمضان المبارک میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق کثرتِ عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے‘ لیکن اپنے ذوق کو دوسروں پر مسلّط کرتے ہوئے‘ ان کی نیکی کو اپنے پیمانوں سے ماپنا نہیں چاہیے۔ علمائے سلف رمضان المبارک میں مصروفِ مجاہدہ و محنت تو رہے لیکن اس مجاہدے کا ظہور مختلف جوانب نیکی میں ہوتا رہا۔ بعض تلاوتِ قرآن پر زیادہ زور دیتے اور بعض تدریس پر اور بعض کسی دوسرے امر پر۔ ذیل میں چند روایات ملاحظہ کیجیے:

حضرت قتادہؒ رمضان میں قرآن پاک کے درس و تدریس کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔

زبید الیامیؒ کا معاملہ یہ تھا کہ جب رمضان داخل ہو جاتا تو اپنے مصحف نکال لیتے اور اپنے ساتھیوں کو اپنے پاس جمع کر لیتے۔ جب رمضان داخل ہوتا تو سفیان ثوریؒ دیگر تمام (نفل) عبادات چھوڑ دیتے اور قراءت قرآن کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ (لطائف المعارف)

عبداللہ بن عباسؓ جب بصرہ کے امیر تھے تو وہ رمضان میں لوگوں کو جمع کرتے (اور انہیں دین کی تعلیم دیتے) اور مہینہ گزرنے تک انہیں دین سکھا دیتے۔‘‘ (الاصابہ فی تمییز الصحابۃ)

شیخ حسن بن محمد الشافعیؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہر سال رمضان میں صحیح بخاری کا حفظ برقرار رکھنے کے لیے اس کا ختم کرتے تھے۔‘‘ (الکواکب السائرۃ باعیان المئۃ العاشرۃ)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ دن کے بالکل ابتدائی حصے میں قرآن کی تلاوت بطور ناظرہ شروع کرتی تھیں‘ یہاں تک کہ سورج طلوع ہونے کے بعد سوتی تھیں۔ (لطائف المعارف)

ابن شہاب الزہریؒ رمضان میں تلاوتِ قرآن اور لوگوں کو کھانا کھلانے میں بہت اہتمام کرتے۔ (لطائف المعارف)

ان روایتوں میں ہم دیکھ رہے ہیں اسلاف کے نیکی میں کثرت کے انداز مختلف ہیں۔ اختلافِ ذوق کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان میں قرآن کی تدریس و بیان پر زیادہ زور دیا اور اسی درسِ قرآن کو شب بیداری کا ذریعہ بنایا اور اس کی دعوت و تحسین کیا کرتے تھے۔ آپ نے ایسے مراکز قائم کیے جن میں دورۂ ترجمہ قرآن کی روایت جاری رہ سکے۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں رمضان کی راتیں قرآن ہی کے ساتھ لیکن دوسرے انداز میں گزرا کرتی تھیں‘ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر صاحبؒ نے ان

کے طرزِ عمل کی تعریف فرماتے ہوئے لکھا:

’’شاید آپ کو بھی یہ بات معلوم ہو کہ ہمارے یہاں یہ (شب بیداری کی) روایت جاری رہی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے متعلق میرے علم میں یہ ہے کہ ان کی حیات میں وہاں پورے رمضان المبارک کے دوران تراویح میں دو دو اور تین تین ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے یا نہیں۔ وہاں کا معمول یہ نہیں تھا جس سے ہم واقف اور جس کے ہم عادی ہیں کہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں بیس تراویح اور بعد کے تین وتر پڑھے اور فارغ ہو گئے۔ بلکہ خانقاہ میں معمول یہ تھا کہ ہر چار رکعاتِ تراویح کے بعد آدھا آدھا گھنٹہ پون پون گھنٹہ وقفہ ہوتا تھا جس میں لوگ مختلف اشغال میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگ اذکار و اوراد میں لگ جاتے تھے‘ کچھ علیحدہ علیحدہ ٹکڑیوں میں بٹ جاتے تھے جن میں وعظ و نصیحت ہوتی تھی‘ کچھ لوگ قرآن مجید سے جو اگلی چار رکعتوں میں پڑھایا جانا ہوتا تھا اس متن کی تلاوت کر رہے ہوتے‘ اس کے بعد پھر کھڑے ہو کر اگلی چار رکعتیں پڑھی جاتیں۔ ہر تراویح کے دوران پورے رمضان میں یہ دستور رہتا تھا۔ اس طرح ساری رات قرآن مجید اور ذکر و وِرد میں گزرتی تھی۔‘‘ (عظمتِ صیام و قیامِ رمضانِ مبارک)

تین دن سے کم میں قرآن کا دور مکمل کرنا

جب ہم اصحابِ سلف سے ایسا کچھ منقول پاتے ہیں کہ وہ تین دن سے کم میں قرآن ختم کیا کرتے تھے اور بعض کے بارے میں تو یہ تک منقول ہے کہ وہ ہر دن قرآن ختم کیا کرتے تھے اور بعض ہر رات قرآن ختم کیا کرتے تھے تو ایسی اخبار سن کر انسان کو اوّلاً تعجب ہوتا ہے اور ان روایات کی صحت مشکوک اور سلف کی مبالغہ آمیزی کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ اور اگر ان اخبار کو درست مانا جائے تو بعض احادیث صحیحہ کی رو سے کہ جن میں تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے اور رات بھر جاگنے کی ’’ممانعت‘‘ منقول ہے‘ اَسلاف کے بارے میں سنت کی خلاف و رزی کا گمانِ فاسد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں وضاحت کی ضرورت ہے۔

تلاوت کی کثرت ہو یا عبادات کی‘ ایک کثرت تو وہ ہے جو رمضان میں کی جائے اور ایک غیر رمضان میں۔ جہاں تک رمضان کی حد تک اتنی شدید مشقت کی بات ہے تو اس کا آسان جواب امام ابن رجب الحنبلیؒ کے الفاظ میں یوں ہے:

’’تین دن سے کم میں قراءتِ قرآن کی جو ممانعت ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جب

اس پر ہمیشگی اختیار کی جائے' اور جہاں تک فضیلت والے اوقات جیسے رمضان بالخصوص اس کی ان (طاق) راتوں میں جن میں لیلۃ القدر تلاش کی جاتی ہے یا مقدس اور فضیلت والے مقامات مثلاً مکہ شریف وغیرہ میں جو باہر کا آدمی رکا ہو تو ان تمام ظروف واحوال میں مندرجہ بالا ممانعت لاگو نہیں ہوتی' بلکہ اس کے لیے مستحب ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے تاکہ ان اوقات یا ان مقامات کی فضیلت میں سے اپنا حصہ پائے۔ یہ امام احمدؒ' اسحاق بن راہویہ اور دیگر ائمہ کرام کا قول ہے اور ان کے علاوہ عام صالحین کا طرزِ عمل بھی اسی رائے پر دلالت کرتا ہے۔'' (لطائف المعارف)

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ رمضان کے شرف کی وجہ سے اس مہینے میں اگر شدید قسم کی مشقت اٹھائی جائے تو جائز ہے۔ ہمارے ہاں اس کی مثال دورۂ ترجمہ قرآن بھی ہے کہ ویسے تو سنت میں روزانہ کے وعظ' لمبے دروس اور پوری رات جاگنے کو پسند نہیں کیا گیا' لیکن ایک خاص مہینے کی برکت حاصل کرنے کے لیے یہ مشقت نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے' بشرطیکہ اسے لازم قرار نہ دیا جائے' ترغیب وتشویق سے لوگوں کو اس میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے اور اس کی پابندی نہ کر سکنے والوں کو حقیر نہ سمجھا جائے۔

ابن رجب الحنبلیؒ کے جواب سے اس قسم کی مشقت کا جواز' رمضان یا اس جیسے فضیلت کے حامل اوقات ومقامات ہی میں ثابت ہوتا ہے۔ اب اشکال یہ ہے کہ اسلاف کے بیان کردہ واقعات میں سے بعض کے غیر رمضان کا معمول بھی اسی قدر مشقت آمیز ہے۔ اور بہت سارے عام دنوں کے معمولات تو ہم نے نقل بھی نہیں کیے' ورنہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اب سوال ہے غیر رمضان میں اس ''جواز'' کا کیا جواز ہے؟ اس کا جواب تفصیل کا متقاضی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک مختصر جواب جو امام شاطبی نے اپنی عظیم الشان کتاب ''الاعتصام'' میں' یہ واقعات نقل کرنے کے بعد اور اشکالات کا تفصیلی جواب دینے سے پہلے دیا ہے' ان کے الفاظ یوں ہیں: ''ان واقعات کے عاملین سنت کو خوب جاننے والے تھے اور ایک لمحہ بھی سنت سے ہٹنے والے نہ تھے۔'' پس تفصیل کو سمجھے بغیر اسلاف پر سنت کی خلاف ورزی کا بہتان لگانا بڑی جسارت ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو جاننا چاہیے کہ یہ روایات بالکل درست ہیں اور سند کے ساتھ منقول ہیں' نیز ان کے نقل کرنے والے عام مؤرخین یا تذکرہ نگار نہیں بلکہ امام نوویؒ

(التبیان فی آداب حملۃ القرآن)' امام ابن رجب الحنبلیؒ (لطائف المعارف)' امام ذہبی' ابن اثیر' ابن عساکر' ابو النصر المروزی (مختصر قیام اللیل) اور ابن جوزی رحمہم اللہ جیسے محدثین ہیں اور بیان کرنے والے وہی راوی ہیں جو احادیث کے راوی ہیں اور تمام ہی شارحینِ حدیث نے جو خود ایک خاص درجے کے محدث ہوتے ہیں' ان روایات کو درست مانا ہے۔

عصرِ حاضر کے معروف اہلِ حدیث عالمِ دین جناب حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ان روایات کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے:

> ''اس کتاب میں ہمارے بہت سے اسلاف کے شوقِ تلاوت اور خصوصی رغبت و اہتمام کے ایسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں جن پر بظاہر یقین کرنا مشکل ہے۔ بہرحال وہ سیر وتراجم یا آثار میں محفوظ ہیں جنہیں صاحبِ کتاب نے نقل کیا ہے۔ ان (واقعات) کو ان (اسلاف) کے اوقات میں خصوصی برکت یا کرامت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل ہم دوں ہمت اور کور ذوق قسم کے لوگ اسلاف کے سے ذوق وشوق سے بھی محروم ہیں اور اس جذب وکیف سے بھی عاری جس سے ہمارے اسلاف تلاوت کے وقت لذت اندوز ہوتے تھے اور ایمان کی اُس حلاوت اور اس کی افزونی سے بھی بے بہرہ جس سے وہ ان پر کیف لمحات میں بہرہ ور ہوتے تھے۔ اپنی انہی کوتاہیوں کی وجہ سے شاید ہم اس لطف وعنایت ربانی اور انوار وتجلیاتِ رحمانی کے بھی سزاوار نہیں رہے جو اسلاف کا طرۂ امتیاز تھے۔'' (تقریظ' کتاب: تلاوتِ قرآن اور ذکرِ الٰہی کے سنہری اوراق)

کیا اتنی کم مدت میں تکمیل قرآن ناممکن ہے؟

ایک اشکال یہ ذہن میں آتا ہے کہ ایک رات یا اس سے کسی قدر کم مدت میں قرآن کا دور مکمل کرنا ممکن نہیں۔ اس بابت عرض ہے کہ یہ عین ممکن ہے۔ بالخصوص اس دور کے لوگوں کے لیے کہ جو عربی تلفظ میں رواں تھے' ان کے اوقات میں برکت دی گئی تھی اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید ونصرت بھی ان کے شامل حال رہتی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہر رات قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ آپ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: ((كَيْفَ تَخْتِمُ)) تم کیسے ختم قرآن کرتے ہو؟ تو آپؓ نے جواب دیا: ''ہر رات''۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روکنے سے پہلے وہ ہر رات میں قرآن ختم کیا کرتے

تھے۔ایک دوسری روایت کے مطابق فرماتے ہیں: ''میں نے قرآن جمع یعنی پورا حفظ کرلیا پس میں ہر رات اس کی قراءت کرلیتا تھا۔'' (مسند احمد)

پس یہ امر محال نہیں ہے اور آج بھی ایسے مدارس موجود ہیں' مثلاً دارالہدیٰ قرآنک ایجوکیشن ٹرسٹ لاہور (زیرنگرانی جناب حافظ محمد رفیق صاحب حفظہ اللہ) جو حفظ کے امتحان میں بچوں سے پورا قرآن ایک ہی دن میں سنتے ہیں اور ہر سال کئی بچے بچیاں قرآن سناتے ہیں۔ بحمدہ تعالیٰ راقم کی دو بیٹیوں نے یہ سعادت حاصل بھی کر رکھی ہے۔

تین صحابہ کرامؓ کا ایک رات میں ختمِ قرآن

تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ وہ ایک رات میں مکمل قرآن پڑھ لیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ سے اس کا ثبوت کم از کم درجے میں اس کے جواز پر تو دلالت کرتا ہے۔ یہ تین حضرات سیدنا عثمان غنیؓ' سیدنا تمیم داری اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ ''منہاج السُّنّہ'' میں لکھتے ہیں: عثمان رضی اللہ عنہ نے بلاشبہ پورا قرآن یاد کر رکھا تھا اور کبھی کبھی ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیا کرتے تھے۔''

محمد بن نصر بن الحجاج المَرْوَزِی اپنی کتاب ''قیام اللیل وقیام رمضان وکتاب الوتر'' میں اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے' سائب بن یزیدؒ سے روایت ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے وتر کی ایک رکعت میں مکمل قرآن پڑھا۔ مکمل کا ترجمہ ''القرآن'' کی وجہ سے کیا گیا ہے' ورنہ امام شاطبیؒ نے ''الاعتصام'' میں جو روایت نقل کی ہے اس میں ''مکمل'' کا لفظ موجود ہے۔ یہ دونوں روایتیں بالکل صحیح اور صریح ہیں۔ ''الاعتصام'' کے محققین اور امام ابن حجرؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

محمد بن سیرین روایت کرتے ہیں کہ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا گیا تو ان کی اہلیہ محترمہؓ نے محاصرہ کرنے والوں سے کہا: ''کیا تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو؟ تم انہیں قتل کرو یا چھوڑ دو' وہ ایک ہی رکعت میں رات گزار دیتے ہیں اور اس میں پورا قرآن پڑھتے ہیں۔'' (مجمع الزوائد' طبرانی)

عبدالرحمٰن التیمی بیان کرتے ہیں کہ میں رات نماز پڑھنے لگا تو میں نے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ سنی۔ میں نے نظر دوڑائی' دیکھا کہ حضرت عثمانؓ ہیں تو ان کی طرف کھسک آیا۔ وہ آگے

بڑھے اور قرآن شروع کیا یہاں تک کہ ختم کر دیا۔'' (شرح معانی الآثار)

امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاویؒ اپنی سند سے بیان کرتے ہیں: ''ابن سیرینؒ سے روایت ہے' کہتے ہیں کہ تمیم الداری رضی اللہ عنہ تمام رات قیام کیا کرتے تھے اور ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پڑھ دیا کرتے تھے۔'' (شرح معانی الآثار)

امام بدرالدین العینیؒ نے ''نخب الأفكار فی تنقيح مبانی الأخبار فی شرح معانی الآثار'' میں دو سندیں بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ دونوں اسناد ثقات راویوں پر مشتمل ہیں۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی نقل کی گئی ہے: محمد بن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ تمیم الداری رضی اللہ عنہ ایک رکعت میں کل قرآن پڑھ لیا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ اپنی کتاب ''فضائل القرآن'' میں اس روایت کے ساتھ چند دیگر روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ان تمام روایات کی اسناد صحیح ہیں۔

امام طحاوی شرح ''معانی الآثار'' میں نقل کرتے ہیں: عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے قرآن ایک رکعت میں ختم کیا۔ اس روایت کی سند کے افراد کو علامہ عینیؒ ثقہ صدوق اور رجالِ صحیحین فرماتے ہیں۔

کیا اتنی کم مدت میں قرآن کی تکمیل کرنا خلاف سنت ہے؟

یہ معاملہ غورِ طلب ہے کہ آیا اس انداز سے جو علمائے سلف قرآن پڑھا کرتے تھے تو کیا ان کا یہ فعل سنتِ نبوی سے متصادم تو نہ تھا؟ اس پر تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علمائے سلف کی ایک بڑی تعداد سے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرنا منقول ہے اور ان میں صحابہؓ اور تابعینؒ تک شامل ہیں' لہٰذا ان کا سنت کے خلاف کرنا بعید از قیاس ہے' جیسا کہ مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے ان چند بزرگوں کا طرزِ عمل بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''جب ہم سلف سے لے کر خلف تک یہ معاملہ موجود پاتے ہیں تو ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ ان حضرات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث کی خلاف ورزی کا الزام عائد کریں۔ اللہ کی پناہ' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ وہ تو سنت پر عمل کرنے میں سب سے بڑھ کر تھے۔''

تین دن سے کم میں ختم کرنے پر اختلاف

چنانچہ قدیم علماء اور صلحاء پر سنت کی خلاف ورزی کا الزام لگانے سے بہتر ہے کہ اس

حقیقت کو مانا جائے کہ تین دن سے کم میں تلاوت کا دور مکمل کرنا' مختلف فیہ معاملہ ہے۔ بعض علمائے سلف نے اس کی اجازت دی ہے اور بعض اس کے قائل نہیں تھے۔ لہٰذا ہر ایک اپنے اجتہاد کے مطابق عند اللہ ماجور ہے۔ جن علماء سے تین دن سے کم میں قرآن مکمل کرنا منقول ہے تو وہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ حضرات ممانعت کے مضمون کی حامل روایات سے نابلد تھے یا وہ جان بوجھ کر سنتِ رسول کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے تھے' بلکہ وہ اس طرزِ عمل کو جائز سمجھ کر اختیار کرتے تھے۔

علمائے سلف کے اس اختلاف کا ذکر امام ترمذیؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے' فرماتے ہیں: ''بعض اہلِ علم نے حدیث عبداللہ بن عمروؓ کی بنیاد پر قرار دیا ہے کہ قرآن کا ایک دور تین دن سے کم عرصے میں نہ کیا جائے اور بعض اہل علم نے اس کی اجازت دی ہے۔ سیدنا عثمانؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ وتر کی ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیا کرتے تھے۔ عظیم تابعی سعید بن جبیرؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں ایک رکعت کے دوران قرآن مکمل پڑھ لیا تھا۔

اس ضمن میں عبداللہ بن عمروؓ کی روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں تین دن سے کم میں تلاوت کے دور کی تکمیل سے روک دیا تھا۔ آپ خود بیان فرماتے ہیں:

> ''میرے والد صاحب نے مجھے قریش کی ایک خاتون سے بیاہ دیا۔ جب وہ میرے پاس رخصت ہو کر آئی تو میں نے اس سے قربت نہیں کی بسبب قوتِ عبادت اور نماز' روزے کے۔ پس والدِ محترم عمرو بن العاصؓ اس کے حجرے میں گئے اور اس سے پوچھا کہ تم نے اپنے خاوند کو کیسا پایا؟ کہنے لگی: بہت اچھے مرد یا خاوند ہیں' البتہ نہ تو وہ ہمارے ساتھ پردے میں داخل ہوئے اور نہ ہی ہمارے بستر کو پہچانا۔ پھر والد صاحب میری طرف آئے اور مجھے سخت سست کہا' باتوں میں مجھے خوب لتاڑا اور کہا میں نے قریش کی عزت وحسب والی عورت تیرے نکاح میں دی اور تو نے اس کے حقوقِ زوجیت پامال کیے اور تو نے یہ کیا اور تو نے وہ کیا..... پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور میری شکایت کی۔''

ایک دوسری روایت کچھ یوں ہے:

> ''عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ (جب میرے والد صاحب کی شکایت پر حضور ﷺ نے مجھ سے بات کی تو) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں کتنا قرآن

پڑھا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چالیس دن میں ختم کیا کرو۔ میں نے عرض کیا: میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مہینے میں ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پچیس دنوں میں ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا بیس دنوں میں ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ اچھا پھر پندرہ دن میں ایک ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ دس دن میں ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا سات دن میں ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کی کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا: اچھا پھر تین دن میں ایک دور مکمل کر لیا کرو۔'' (مسند احمد' ترمذی' سنن ابوداؤد)

ایک روایت کچھ یوں ہے:

> ''عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مکمل قرآن جمع کر لیا یعنی حفظ کر لیا۔ پس میں ہر رات اس سارے کی قراءت کرتا۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ جب ایک لمبی مدت گزر رے تو تمہارا جی اکتا جائے' پس تم مہینے میں ایک دفعہ پڑھ لیا کرو.....'' (مسند احمد)

صورتحال یوں تھی کہ عبداللہ بن عمروؓ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ ایک جوان بیوی کے جوان شوہر تھے اور ان کے اس طرزِ عمل سے ان کی بیوی کے حقوق ضائع ہو رہے تھے۔ یہاں تک وہ محترمہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں اور سسر صاحب کے حال پوچھنے پر شوہر نامدار کے حالات بھی گوش گزار کر دیے' جس پر سسر صاحب یعنی عمرو بن العاصؓ نے نبی اکرم ﷺ کی جناب میں شکایت کر دی۔ اس پر ازراہِ شفقت نبی اکرم ﷺ نے انہیں زیادہ تلاوت کرنے اور زیادہ روزے رکھنے سے روک دیا۔ لفظ شفقت کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں اوّلاً چالیس دن میں قرآن مکمل کرنے کی ترغیب دی تھی' حالانکہ صحابہؓ کا عام معمول سات دن میں قرآن پڑھنے کا تھا۔ جب عبداللہ بن عمروؓ برابر عرض کرتے رہے کہ میں اس سے کم دنوں میں دور مکمل کرنا چاہتا ہوں' تب آپ ﷺ نے بالترتیب' تیس' پچیس' بیس' پندرہ' دس' سات اور بالآخر تین دن میں دور مکمل کرنے کی تاکید فرمائی۔

علامہ بدرالدین العینیؒ اس ممانعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مزید تلاوت کرنا یعنی کم دنوں میں تکمیل قرآن کرنا تحریم کے لیے نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح اس روایت میں کیے جانے والے حکم وجوب کے لیے نہیں ہیں۔'' (عمدۃ القاری)

علامہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کہا کہ چالیس دن میں ختم کیا کرو' یا مہینے میں ختم کیا کرو' یا سات دن میں یا تین دن میں' یہ جو امر کے صیغے ہیں' ان کی رو سے خود ابن عمروؓ پر بھی اور دوسروں پر بھی، چالیس یا تیس یا دس یا سات یا تین دن میں قرآن کی تکمیل کرنا واجب نہیں ہوا۔ اسی طرح جب تین دن سے کم ایام میں تکمیل قرآن سے منع کیا تو اس سے کم دنوں میں ختم کرنا بھی حرام نہیں ہوا۔

پس معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کہ تین دن سے کم میں ختم نہ کیا جائے کوئی قانونی درجے کی ہدایت نہیں ہے بلکہ ایک شفقت و نرمی کا انداز ہے اور یہ ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ مختلف لوگوں کو مختلف انداز سے ہدایات دیا کرتے تھے۔ ایک روایت ملاحظہ کیجیے:

حضرت سعد بن منذر الانصاریؓ سے روایت ہے' میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ کیا میں تین دن میں قرآن مکمل کرلیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کرلیا کرو اگر استطاعت رکھتے ہو تو۔ اور وہ مرتے دم تک اس نصاب پر قائم رہے۔'' (مسند احمد' الفضائل)

ان صحابیؓ نے اپنے لیے جس نصاب کی اجازت مانگی' اگرچہ وہ بہت زیادہ تھا لیکن آپؐ ان کے حالات سے یقیناً واقف تھے' اس لیے آپ نے عبداللہ بن عمروؓ کی طرح چالیس یا تیس دن کی پیشکش نہیں کی بلکہ انہیں اجازت دے دی۔

قیس بن صَعْصَعَہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی مکرم ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہؐ میں کتنے دن میں تلاوت قرآن کا ایک دور مکمل کیا کروں؟ فرمایا: پندرہ دن میں۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ میں زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ہر ہفتے ختم کرلیا کرو۔'' (فضاء القرآن لابن کثیر)

اشکالِ محال

ان واقعات کے بارے میں اگر اشکال پیش آتا ہے کہ یہ تو محال ہیں تو اس بابت (بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ) بیہقیؒ وقت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ لکھتے ہیں:

''علامہ ابن کثیرؒ نے علومِ قرآنیہ پر ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں ایک خاص فصل میں

انہوں نے ان لوگوں کے نام بیان کیے ہیں جنہوں نے ایک دن رات یا اس سے بھی کم مدت میں قرآن ختم کیا۔ پس اس طرح کی روایات کثرت کے سبب حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں کہ ان کا انکار کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ خیر سے روک دیے گئے ہیں انہوں نے اپنا حصہ ہی یہ ٹھہرالیا ہے کہ کرامات و برکات کا انکار کرتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ ان واقعات کا ہونا محال ہے۔'' (فیض الباری)

مولاناؒ نے کرامت کا ذکر فرمایا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ آگے پیش کی جانے والی بعض روایات کا اس کے بغیر کوئی حل نہیں کہ انہیں ان بزرگوں کی کرامات مانا جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''داؤد علیہ السلام پر قرآن کی تلاوت آسان کردی گئی تھی۔ آپؑ گھوڑے پر زین کسنے کا حکم دیتے اور اس سے پہلے کہ زین کسی جاچکے' قرآن کی تلاوت سے فارغ ہوجاتے تھے۔'' (بخاری)

اس روایت میں ''قرآن'' کا لفظ استعمال کیا گیا' حالانکہ قرآن آپؑ کے کافی عرصے بعد نازل ہوا۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں: ''سیدنا ابوذرؓ کی روایت میں قرآن کی جگہ قراءت کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس سے مراد قراءت کا مصدر ہے' اور وہ قرآن مراد نہیں جو امت محمدیہؐ میں معروف ہے۔''

مُلّا علی القاریؒ لکھتے ہیں: ''قرآن سے مراد زبور شریف کی قراءت اور اس کا حفظ ہے اور یعنی یہ دونوں چیزیں ان پر بہت آسان کردی گئی تھیں۔''

حضرت تورپشتیؒ فرماتے ہیں: ''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وقت کو لپیٹ دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور اسی طرح وہ مکان کو بھی لپیٹ دیتا ہے جس کے لیے وہ چاہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس میں جھانکا بھی نہیں جاسکتا فیض ربانی کے بغیر۔'' (مرقاۃ المفاتیح)

مُلّا علی القاریؒ فرماتے ہیں:

''حاصل یہ کہ ان کا یہ معاملہ خرقِ عادت تھا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ان کے لیے زمانے کو پھیلایا گیا یا ان کی زبان کو لپیٹ دیا گیا۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جو رسول اللہ ﷺ کو سفر معراج میں اپنی کامل صورت میں پیش آئی کہ آپ کو طی المکان (جگہ یا مسافت کو سمیٹنا) اور بسطِ زمان (وقت کو پھیلا دینا) دونوں سے سرفراز کیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کے سچے پیروکاروں کو بھی اس معاملے میں سے ایک

حصہ دیا جاتا رہا ہے۔''

بدرالدین العینیؒ لکھتے ہیں:

''اس میں راہنمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اسے قیدِ زمان سے آزاد کر دیتا ہے اور یہ فیض الٰہی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ کبھی تھوڑے سے وقت میں برکت نازل ہوتی ہے اور اس میں بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کثرتِ تلاوت میں جو سب سے زیادہ مقدار ہم تک پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اشخاص چار ختم رات کو کر لیتے تھے اور چار دن کو۔ میں (یعنی علامہ عینی) کہتا ہوں کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو حافظ تھا کہ اس نے لیلۃ القدر میں وتر کی تین رکعتوں میں تین ختم کیے۔''

اصطلاح میں طی المکان کہا جاتا ہے جگہ یا مسافت کے سمیٹ لینے کے لیے۔ کسی کام کو جلد کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کام کم کر دیا جائے اسے سمیٹ لیا جائے' اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوت کو زیادہ کر دیا جائے' وقت کو پھیلا دیا جائے تاکہ کام سہولت کے ساتھ انجام پا سکے۔

الاسراع والترتیل

اس قدر زیادہ تلاوت کا جب ذکر آتا ہے تو یہ اشکال پیش آتا ہے کہ اس میں ترتیل کی فضیلت مجروح ہوتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اپنی سنن میں یہ روایت بیان کی ہے:

((لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ))

''جس نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کیا اس نے قرآن کو سمجھا نہیں۔''

اس کے بعد امام لکھتے ہیں:

''بعض اہلِ علم نے اس حدیث کی بنیاد پر کہا ہے کہ تین دن سے کم میں قرآن ختم نہیں کرنا چاہیے جبکہ بعض اہلِ علم نے اس کی اجازت دی ہے' اور سیدنا عثمان ؓ اور سعید بن جبیر ؒ سے ایک رکعت میں مکمل قرآن پڑھنا منقول ہے جبکہ اہل علم کے نزدیک ترتیل زیادہ پسندیدہ ہے۔''

محمد عبدالرحمٰن المبارکپوری نے ''تحفۃ الاحوذی شرح سنن الترمذی'' میں کوئی دو درجن کے نزدیک وہ روایات نقل کی ہیں جن میں کسی کے ایک رات یا ایک دن یا دن رات کے ایک مختصر حصے میں قرآن کا دور مکمل کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''اگر تم ائمہ حدیث کے تذکروں اور تعارفی کتابوں کا تتبع کرو تو تم پاؤ گے کہ ان کی ایک

بڑی تعداد مکمل قرآن تین دن سے کم میں مکمل پڑھ لیا کرتے تھے۔ پس اصل بات یوں ہے کہ ان علماء وائمہ نے تین دن سے کم میں قرآن کی تکمیل کی ممانعت کو تحریم پر محمول نہیں کیا۔ البتہ میرے نزدیک راجح قول وہ ہے جس کی طرف امام احمد اور اسحاق بن راہویہؒ گئے ہیں' جبکہ اہل علم کے نزدیک ترتیل زیادہ پسندیدہ ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ ترتیل سے پڑھا کرتے تھے اور آپؐ کے الفاظ الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ترتیل پسندیدہ اور اولیٰ ہے۔''

امام ابن حجر عسقلانیؒ نے جلدی پڑھنے اور ترتیل سے پڑھنے' دونوں کا جواز نقل کیا ہے' آپؒ فتح الباری (باب الترتیل فی القراءۃ) میں لکھتے ہیں:

''ترتیل حروف واضح کر کے آرام سے ادا کرنے کو کہتے ہیں تاکہ الفاظ کے معنی سمجھ میں آتے رہیں۔ ترتیل کا حکم جو قرآن پاک میں دیا گیا اگرچہ واجب نہیں لیکن مستحب تو ہے۔ امام بخاریؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے قول کی روشنی میں یہ لکھا ہے ''وَمَا يُكْرَهُ أَنْ يُهَذَّ كَهَذِّ الشِّعْرِ'' اس سے اندازہ ہوتا ہے گویا وہ شعر کے سے ہذیانی انداز میں پڑھنے کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے بتانا چاہتے ہیں کہ ترتیل کا استحباب جلدی اور تیزی سے پڑھنے کی کراہت کو مستلزم نہیں ہے' بلکہ جو کراہت ہے وہ هَذّ کے انداز میں پڑھنے میں ہے۔ هَـذ کا معنی وہ انتہائی درجے کی تیزی ہے جس میں بہت سارے حروف ادا ہی نہ ہو سکیں یا پھر الفاظ اپنے مخارج سے ادا نہ کیے جا سکیں (یہ قصور اگر آہستہ پڑھتے ہوئے بھی سرزد ہو تو بھی قابل کراہت ہے) امام بخاریؒ نے اس مطلب کو واضح کرنے کے لیے ابن مسعود ؓ کا قول نقل کیا۔ تیزی اور جلدی سے پڑھنے کے جواز پر باب أحاديث الأنبياء میں ابو ہریرہ ؓ سے مرفوع حدیث (خفف على داوٗد القرآن) دلالت کرتی ہے۔ جو قول عبداللہ بن مسعود ؓ کا امامؒ نے نقل کیا وہ یوں ہے کہ ابوحمزہؒ سے مروی ہے' کہتے ہیں کہ میں نے ابن مسعودؓ سے کہا: میں تین رکعتوں میں پورا قرآن پڑھ لیتا ہوں۔ اس پر ابن مسعودؓ نے فرمایا: مجھے ترتیل اور تدبّر کے ساتھ سورۃ البقرہ پڑھنا زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس طرح پڑھنے کے جیسا کہ تم پڑھتے ہو۔ یہی روایت امام ابن ابی داودؒ نے یوں نقل کی ہے کہ ابوحمزہؒ نے ابن عباسؓ سے کہا کہ میں تیز تلاوت کرنے والا شخص ہوں اور میں ایک ہی رات میں مکمل قرآن پڑھ لیتا ہوں' اس پر ابن عباسؓ نے کہا: میں تو اپنی ایک پسندیدہ سورت پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ اگر تمہیں زیادہ پڑھنا ہی ہے تو اس طرح پڑھ کہ تیرے کان اسے سن سکیں اور تیرا دل اسے سمجھ سکے۔

اس معاملے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ترتیل سے پڑھنے کی فضیلت ایک جہت سے ہے اور تیزی سے پڑھنے کی فضیلت دوسرے اعتبار سے ہے بشرطیکہ تیزی سے پڑھنے والا حروف وحرکات اور سکونِ واجبہ کو ہڑپ نہ کرتا ہو۔ اور یہ بھی کوئی انہونی بات نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کو فضیلت دینے کے باوجود یہ برابر بھی ہوں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جو ترتیل وتدبر کے ساتھ پڑھے گا گویا وہ ایک ہی قیمتی ہیرا صدقہ کر رہا ہے اور جو تیزی سے پڑھ رہا ہے وہ کئی ہیرے صدقہ کر رہا ہے' خواہ ان سب کی قیمت اس ایک قیمتی ہیرے کے برابر ہو' البتہ حالات کے فرق کی بدولت بعض اوقات اس ایک ہیرے کی قیمت، بہت ساروں سے زیادہ نکلتی ہے اور بعض اوقات اس کے بالعکس ہوتا ہے' یعنی بہت سارے ہیرے مل کر اس ایک بڑے ہیرے سے زیادہ قیمتی بن جاتے ہیں۔'' (فتح الباری)

تین دن سے کم میں نفی فقہ

ایک اشکال یہ بھی پیش آتا ہے کہ تیزی سے پڑھنے میں انسان قرآن کو سمجھ نہیں سکتا اور جو شخص ہمیشہ تین دن سے کم میں ختم کرتا ہے وہ سمجھ سے محروم ہی رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ اقدس بھی ہے: ''جس نے تین دن سے کم میں قرآن کا دور مکمل کیا اس نے قرآن نہیں سمجھا''۔

صاحبِ مرقاۃ لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں فہم کی نفی کی گئی ہے نہ کہ ثواب کی۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اشخاص اور ان کی ذہانتوں کے فرق کی وجہ سے فہم قرآنی بھی یکساں نہیں ہوتا۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ثواب کا معاملہ ہے تو وہ مجرد قراءت قرآنی پر ہے اور وہ سمجھ کر پڑھنے والے اور بلا سمجھے پڑھنے والے دونوں کو حاصل ہوتا ہے' اس لیے کہ قرآن کے الفاظ کا پڑھنا اپنی ذات ہی میں عبادت ہے۔''

امام یحییٰ بن محمد الذہلی الشیبانی اپنی شرح **الإفصاح عن معانی الصحاح** میں حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے سے بیان کردہ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''اس حدیث میں حفظ اور سننے سنانے کی غرض سے جلدی جلدی قرآن پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح سے پڑھانا کسی ایک وقت میں ہو اور تدبّر کسی دوسرے وقت میں ہو۔''

یہ ایک عمدہ بات ہے اور اسلاف کی حد تک ایسا ہی ہوتا رہا ہے' یعنی جن لوگوں کا ہم نے بیان کیا کہ وہ اتنا قرآن پڑھتے تھے' مثلاً امام بخاریؒ کہ رمضان میں چالیس سے اوپر دور مکمل

کرتے تھے اور امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ جو ساٹھ دور مکمل کرتے تھے' تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ قرآن کے معنی سے ناواقف ہیں یا انہوں نے اپنی طرف سے تدبر کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس قدر زیادہ تلاوت انہی لوگوں سے ثابت ہے جو علومِ قرآنی سے واقف اور اہل القرآن تھے۔ اور شاید یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ جو قرآن کے ترجمہ وتفسیر سے ناواقف ہو اور اسے سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ علوم قرآنی کی تحصیل کو اپنا ہدف بنائے اور زیادہ وقت اس پر صرف کرے۔ البتہ وہ حضرات جو کسی درجے میں ترجمہ اور تفسیر سیکھ چکے ہیں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ تلاوت کا موقع ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی ایک یا دو رکوع تلاوت کریں' یا یہ کہ ''تلاوت کرتا ہوں جب درس دینا ہوتا ہے'' کا مظاہرہ کریں تو قطعاً مناسب نہیں ہے۔ رہی نصاب کی بات تو اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

''قرآن مجید کے حق تلاوت کی ادائیگی کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کو زندگی کے معمولات میں مستقل طور پر شامل کیا جائے اور ہر مسلمان تلاوت کا ایک مقررہ نصاب پابندی کے ساتھ لازماً پورا کرتا رہے۔ مقدارِ تلاوت مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مقدار جس کی آنحضور ﷺ نے توثیق فرمائی ہے' یہ ہے کہ تین دن میں قرآن ختم کیا جائے' یعنی دس پارے روزانہ پڑھے جائیں۔ اور کم سے کم مقدار' جس سے کم کا تصور بھی ماضی قریب تک نہ کیا جاسکتا تھا' یہ ہے کہ ایک پارہ روزانہ پڑھ کر ہر مہینے قرآن ختم کرلیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ کم از کم نصاب ہے جس سے کم پر تلاوتِ قرآن کے معمول کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ درمیانی درجہ جس پر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم عامل تھے اور جس کا حکم بھی ایک روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیا تھا' یہ ہے کہ ہر ہفتے قرآن ختم کرلیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں قرآن کی تقسیم سورتوں کے علاوہ صرف سات احزاب میں تھی' جن میں سے پہلے چھ احزاب علی الترتیب تین' پانچ' سات' نو' گیارہ اور تیرہ سورتوں پر مشتمل ہیں اور ساتواں جو حزبِ مفصّل کہلاتا ہے' بقیہ قرآن مجید پر مشتمل ہے۔ اس طرح ہر حزب کم وبیش چار پاروں کا بنتا ہے جن کی تلاوت انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ دو گھنٹوں میں کی جاسکتی ہے' جو دن رات کے عشر سے بھی کم ہے۔

تلاوتِ قرآن مجید کا یہ نصاب ہر اُس شخص کے لیے لازمی ہے جو دینی مزاج اور

مذہبی ذوق رکھتا ہو اور قرآن مجید کا حقِ تلاوت ادا کرنے کا خواہش مند ہو‘ چاہے وہ عوام میں سے ہو یا اہل علم وفکر کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو‘ اس لیے کہ جہاں تک روح کے تغذیہ وتقویت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے تو سب ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کو اس سے ذکر وموعظت حاصل ہوگی اور اہلِ علم وفکر حضرات اس سے اپنے علم کے لیے روشنی اور فکر کے لیے رہنمائی پائیں گے۔‘‘

چنانچہ ایک مسلمان کا نصابِ تلاوت کم ازکم ایک پارہ روزانہ سے شروع ہوکر ایک منزل روزانہ یا تین دن میں قرآن کی تکمیل کرنے سے گزرتا ہوا‘ اس ’’قرآنی حال‘‘ تک پہنچ سکتا ہے جو اوپر مذکورہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم‘ بعض ائمہ کرام اور دیگر اسلاف کا بیان ہو چکا ہے۔ اور اس ’’قرآنی حال‘‘ کا تعلق بھی یقیناً نصاب سے ہی ہے‘ کہ جب انہوں نے اپنی طرف سے زیادہ سے زیادہ نصاب اختیار کر لیا مثلاً تین دن میں ختم قرآن تو اللہ نے ان پر مزید کا دروازہ کھول دیا۔

اشکالِ بدعت

بعض حضرات اسلافِ اُمت کی عباداتِ شاقہ پر بدعت کا حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ حکم ان ہستیوں کے بارے میں لگایا جاتا ہے جو نہ صرف ناقل سنت ہیں بلکہ معیارِ سنت بھی ہیں۔ لہٰذا اس موقف کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

امام شاطبیؒ نے جو ردّ بدعت میں مشہور ہیں‘ اپنی کتاب ’’الاعتصام‘‘ میں اس مسئلے پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ آپ نے کتاب کے پانچویں باب میں بدعت کی تعریف واقسام بیان کی ہیں اور ایک قسم کو بدعت اضافی قرار دیا ہے‘ جو اپنی ذات میں بدعت نہیں ہوتی لیکن بعض وجوہات کی وجہ سے وہ بدعت میں شامل ہوسکتی ہے۔ اس بدعت اضافی میں‘ جو اصلاً بدعت نہیں ہوتی انہوں نے عبادات کے بھاری بھرکم معمولات کو بھی شامل کیا ہے۔ اس موقع پر وہ لکھتے ہیں:

’’وہ کام اپنی ذات میں طاقت سے اوپر ہو یا اس میں حرج یا مجروح کرنے والی مشقت لازم آئے یا وہ مشقت ان امور کے ضیاع کا باعث بنتی ہو جو اس سے اوپر ہیں‘ پس یہی وہ طرزِ عمل ہے جسے رہبانیت قرار دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔‘‘

علامہ نے جو تقریر فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ عبادات کے بھاری معمولات اپنی ذات میں ممنوع نہیں ہیں‘ بلکہ ان کا ممنوع ہونا یا بدعت ورہبانیت میں شامل ہونا ان قیود کے ساتھ ہے جو انہوں نے بیان کیں‘ یعنی مشقت اور حقوق کا ضیاع وغیرہ۔ حضرت نے اس رائے کا استنباط مختلف احادیث سے کیا ہے۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ کا سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے فرمانا:

((اِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))

’’یقیناً تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے‘ اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے‘ اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔‘‘

اور سنن ترمذی میں مذکور سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا واقعہ جس میں ان کی بیوی سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ سے کہتی ہیں کہ آپ کے بھائی کو تو ہم سے حاجت ہی نہیں‘ اور اس میں سلمان کا ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کو یہ کہنا: ((وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَأَعْطِ لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ))

حاصل کلام یہ کہ عبادات کے یہ معمولات جو دائمی ہو جائیں تو ان میں مشقت لازم آتی ہے‘ اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے رکنے کا حکم دیا گیا‘ لیکن کبھی صورتحال یہ ہو کہ مشقت ختم ہو جائے تو مشقت کے اٹھتے ہی ان معمولات کی ممانعت کا حکم بھی اٹھ جائے گا اور بات اصل کی طرف لوٹ آئے گی اور وہ عبادات کو انجام دینا ہے۔

علامہ شاطبیؒ نے بہت سارے تابعین اور صحابہ کے مشقت آمیز معمولات کا ذکر کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں:

’’اس معنی کی روایات متقدمین سے بڑی تعداد میں مروی ہیں اور ان کا یہ طرزِ عمل مشقت آمیز معمولات کے جواز پر دلالت کرتا ہے کہ ان معمولات کے ہوتے ہوئے بھی کسی عالم نے ان حضرات کو سنت کے مخالفین میں شمار نہیں کیا‘ بلکہ انہیں سابقین فی الخیرات میں شامل کیا گیا۔ اللہ ہمیں ان میں شامل کرے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت سے روکنا شریعت کے پیش نظر نہیں ہے بلکہ روکنا تو اس غلو سے ہے جو اس عامل پر مشقت کو داخل کرتا ہے۔ پس جس کے حق میں یہ مشقت کی علت ختم ہو جائے (یعنی اس کے حالات داخلی وخارجی کی وجہ سے اسے مشقت نہ پہنچتی) تو مذکورہ نہی اس سے مخاطب ہی نہ ہوگی۔‘‘

امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

''مشقت کا داخل ہونا اور اس کا ختم ہونا' چاہے معمول میں دوام ہو یا نہ ہو' امر منضبط نہیں ہے (جو ہر حال میں اٹل اور نہ بدلنے والا ہو) بلکہ یہ شے اضافی ہے اور لوگوں کے بدلنے اور ان کی جسمانی قوت' قوتِ ارادی اور قوتِ یقین یا اس طرح کے دوسرے جسمانی و روحانی اوصاف کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔ پس ایک ہی عمل کی حیثیت دو آدمیوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہے کہ ان میں سے ایک جسم کے اعتبار سے قوی ہے یا اس کا ارادہ مضبوط ہے یا اللہ کے وعدوں پر پختہ رکھنے والا ہے۔

مشقت مذکورہ (جس کی وجہ سے عبادتِ شاقہ پر دوام پسند نہ کیا گیا تھا) ان بیان کردہ قوتوں اور تقویٰ کی مضبوطی سے آسان اور سہل ہو جاتی ہے۔ ہمارے بیان کردہ اس معنی کی صحت پر دلیل یہ فرمانِ رسول ہے کہ آپ ﷺ نے صومِ وصال پر کلام کرتے ہوئے فرمایا: ''میں تم جیسا نہیں ہوں' میں رات بسر کرتا ہوں اپنے رب کے پاس وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ کہ صوم وصال مجھ پر بھاری نہیں پڑ رہا اور حقوق اللہ اور حقوق الناس کی ادائی میں رکاوٹ نہیں بن رہا۔ پس اس تفصیل کے مطابق جن لوگوں کو رسول اللہ ﷺ جیسے احوال (نوعیت میں مماثل' اگرچہ کیفیات و درجات کا فرق باقی رہے گا) دیے گئے اگر وہ عمل عبادات میں غلو و زیادتی کریں' نشاط کے ساتھ اور اپنی قوت کی زیادتی کی وجہ سے عمل کی مشقت کے خفیف ہو جانے کی بنا پر' تو اس طرح کے معمولات میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

حاصل کلام یہ کہ سلف کے بھاری بھر کم معمولات نہ تو خلافِ سنت اور بدعت ہیں اور نہ ہی محال و ناممکن اور نہ ہی مبالغہ و دروغ' بلکہ سنت کے دائرے کے اندر ہیں' اور صحیح طور پر ثابت ہیں۔ ان کا انکار کرتے ہوئے علمائے سلف پر غلو و بدعت کا حکم نہ لگایا جائے۔

البتہ ایک سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟ تو کرنا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھا جائے' اور جب تین دن میں ختم کرنے والے بن جائیں اور مزید زیادہ پڑھنا چاہیں تو کسی معتبر عالمِ دین سے راہنمائی لے کر آگے بڑھیں۔ آپ کے احوال کا جائزہ لے کر شاید وہ عالم آپ کو اسی پر برقرار رکھیں یا شاید اس میں اضافے اجازت دے دیں۔

❁❁❁

پاکستان کا بیانیہ

شجاع الدین شیخ☆

آج کا موضوعِ گفتگو ہے: ''پاکستان کا بیانیہ''۔ پچھلے چند سالوں سے ہمارے ملک میں نظریاتی سطح پر جو گفتگو چل رہی ہے' اگر وہ آپ کے ذہن میں ہو تو یہ ایک خاصا سیاسی نوعیت کا موضوع محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے' لیکن ہمارے نزدیک سیاست دین کا حصہ ہے اور پاکستان کے حوالے سے کلام کیا جائے تو اسلام کے بیان کے بغیر پاکستان کا بیانیہ نامکمل ہوگا۔ اس پس منظر کے تناظر میں آج یہ موضوع رکھا گیا ہے۔

موضوع کا پس منظر

آپ کے علم میں ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات عرصۂ دراز سے چل رہے ہیں اور اجتماعی طور پر اسے ریاست کے خلاف دہشت گردی کا نام دیا گیا ہے' اس لیے کہ اس میں حکومت' حکومتی اداروں اور افواج کے خلاف حملوں کا معاملہ ہوا اور پھر اس ریاستی دہشت گردی کے خلاف ریاستی اداروں نے کچھ اقدامات 'ضربِ عضب' اور 'ردّ الفساد' کے نام سے کیے۔ اسی کے تناظر میں ریاستی اداروں کا بیانیہ سامنے آیا جس پر ایک بحث شروع ہوئی اور ایک جوابی بیانیہ جاوید احمد غامدی صاحب اور اسی قبیل کے کچھ اور لوگوں کی طرف سے بھی آیا' جن میں خورشید ندیم' مقتدا منصور اور چند دیگر افراد شامل ہیں۔ ان کے بیانیے کا بہت اچھا جواب کچھ علماء اور دانشور حضرات نے دیا۔

بات تو ریاستی سطح پر چلی تھی یعنی ریاست میں جو دہشت گردی ہو رہی تھی' اس کے خلاف ریاستی اداروں نے کچھ اقدامات کرنے تھے تو ایک بیانیہ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اس پر مذکورہ حضرات جو لبرلزم اور سیکولرزم کی طرف رجحان رکھتے ہیں' کی طرف سے جوابی بیانیہ آ گیا

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

اور پھر کچھ اور بیانیے آنا شروع ہو گئے۔ اسی تناظر میں ایک اور بحث کا آغاز ہو گیا اور یہ پھلجھڑی بھی چھوڑ دی گئی کہ پاکستان کو ایک لبرل اور سیکولر ریاست ہونا چاہیے —— یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے' بلکہ گزشتہ ستر سال سے چلتی چلی آئی ہے —— پھر اس کے بھی جوابات دیے گئے۔

بہرحال مباحث کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اسی کے تسلسل میں حال ہی میں ایک نیا بیانیہ ''پیغامِ پاکستان'' کے نام سے سامنے آیا۔ پیغامِ پاکستان' اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے ادارے ''ادارہ تحقیقاتِ اسلامی'' کے تحت ایک بڑی کوشش ہے۔ انہوں نے ایک متفقہ فتویٰ تمام مکاتب فکر کے مفتیانِ کرام (بالخصوص اتحاد تنظیمات المدارس کے پانچوں بورڈ یعنی وفاق المدارس العربیہ' تنظیم المدارس اہلسنت' وفاق المدارس السّلفیہ' وفاق المدارس الشیعیہ' رابطہ بین المدارس پاکستان) سے لیا۔ اس متفقہ فتوے پر ۱۸۲۹ علماء نے اپنے دستخط بھی ثبت کیے ہیں۔ پہلی مرتبہ سیاسی سطح پر علماء کرام کو on board لے کر ایک بیانیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ آج کے موضوع کا پس منظر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بیانیہ

سب سے پہلے جو اصل بیانیہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا' اس کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے سمجھنے کے تسلسل میں پاکستان کے حوالے سے بھی گفتگو ہوگی' اس لیے کہ اس ملک کا سرکاری سطح پر نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے۔ اس نام میں اسلام پہلے ہے اور پاکستان آخر میں۔ چنانچہ اسلام کے تناظر میں کچھ اصولی باتیں ہم سمجھ لیں تو ہمارا کام بڑا آسان ہو جائے گا۔ غامدی صاحب کا جو بیانیہ آیا ہے' جس کے جوابات ہمارے علماء نے دیے' اس کا کچھ تذکرہ بھی آگے چل کر ہماری گفتگو میں ہوگا اور نئے بنائیے ''پیغامِ پاکستان'' کے حوالے سے بھی سیر حاصل گفتگو ہوگی۔

پہلی اصولی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو دیا جانے والا بیانیہ اسلام ہے اور اسلام چند عقائد کا مجموعہ یا محض مذہب (religion) نہیں ہے' بلکہ اسلام کے لیے قرآن نے ''دین'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور معروف حد تک احادیث مبارکہ میں بھی دین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟﴾ (آیت ۱۹) ''یقیناً اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہے''۔ اسی سورہ کی آیت

۸۵ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ ''اور جو کوئی اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا''۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳ میں ارشاد ہوا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا''۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ (آیت ۲۰۸) ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ پھر اسی سورہ کی آیت ۸۵ کا حاصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کے کچھ احکام کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا' یہ تقسیم اللہ ربّ العزت کے ہاں قابل قبول نہیں۔

یہ چند آیات بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن میں اسلام کو لفظ دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ نوٹ کر لیجیے کہ دین کا بہتر ترجمہ ''نظام'' ہے۔ انگریزی میں اسے system کہا جا سکتا ہے۔ گویا اسلام صرف انفرادی زندگی کے لیے رہنمائی نہیں دیتا بلکہ اس کی رہنمائی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور پھر وہ ان تمام گوشوں میں اپنے احکام کے نفاذ کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ اگر اجتماعی سطح پر اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ کا کام نہ ہو رہا ہو تو مفتیٔ اعظم اللہ عزوجل کے تین فتاویٰ سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴' ۴۵ اور ۴۷ میں آئے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں' وہی تو ظالم یعنی مشرک ہیں' اور وہی تو فاسق ہیں۔ دین اسلام کے بارے میں یہ اللہ تعالیٰ کا بیانیہ ہے۔

پاکستان کے بیانیہ کی بنیاد اسلام ہے

پاکستان کے تناظر میں آئیں گے تو یہی باتیں علامہ اقبال کے کلام اور قائداعظم کے ارشادات میں موجود ہیں ـــــ آگے چلنے سے پہلے پاکستان کے نام میں شامل لفظ ''جمہوریہ'' پر بھی کچھ کلام کر لیتے ہیں۔ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو مان لیا جائے' تو ایک درجے میں ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ کسی جائز اور حلال معاملے میں اکثریت کی رائے کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ پانچ افراد پر مشتمل کسی گھر میں مہمان آ رہے ہوں اور یہ مشورہ کیا جائے کہ انہیں کیا پیش کیا جائے؟ اور تین افراد کی رائے یہ آئے کہ گرمی کا موسم ہے' کوئی شربت یا لسّی پیش کر دی جائے تو ان کا یہ مشورہ مان لیا جائے گا۔ اگر پانچوں کی رائے یہ آئے کہ شراب پیش کی جائے تو یہ مشورہ نہیں مانا جائے گا۔ کیونکہ اسلام نے

ہمیں اصول دے رکھا ہے کہ اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھاؤ (الحجرات:۱)۔ وہ جمہوریت جس کی اسلام میں گنجائش ہے' وہ یہی ہے کہ حلال اور جائز معاملات میں اکثریت کی رائے کو مان لیا جائے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے اور اسی رائے پر عمل کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اکثریت کی وہ بات مانی جا رہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدود کے اندر ہو تو مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر اس کا نام جمہوریت ہے تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں' لیکن اگر جمہوریت کے معنی اکثریت کی حکمرانی کے ہیں تو یہ ہمیں منظور نہیں۔ اگر اکثریت حرام کو حلال کرنے کی بات کرے تو اس جمہوریت کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

اب واپس آتے ہیں پاکستان کے بیانیے کی طرف۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ جب یہ ملک بنا تو اس کا پس منظر کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو یہ فکر تھی کہ ہندو متعصب قوم ہے اور اگر انگریز یہاں سے چلا گیا تو ہندو اکثریت ہمارے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گی۔ مفکّر قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی رائے میں یہ ایک منفی نوعیت کا جذبہ تھا کہ ہندو کے خوف سے ہمیں نجات چاہیے تھی۔ البتہ اس جذبے میں جان پڑی اور اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اس ایک نعرہ پر' جس پر پوری قوم نے لبیک کہا۔ وہ نعرہ آج بھی ہمارے بچے اسکول میں پڑھتے ہیں' یعنی: ''پاکستان کا مطلب کیا؟: لا الٰہ الا اللہ!'' مسلم لیگ نے ہندو کے خوف کو زمینی حقیقت کے طور پر اختیار کیا۔ ۱۹۳۷ء میں الیکشن کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ لاہور' جسے قرارداد پاکستان بھی کہا جاتا ہے' کی منظوری کے بعد مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمیں ایسا خطۂ زمین چاہیے جہاں کلمہ طیبہ کے تقاضوں پر عمل کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوئی۔

اب ہم پاکستان کے بیانئے کو پاکستان کے قیام کی وجوہات کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے تجزیے کے مطابق دنیا میں مختلف ممالک موجود ہیں اور ان ممالک میں رہنے والوں میں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ جرمن ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں' لہٰذا جرمنی موجود ہے۔ فرانسیسی قوم ایک زبان بولتی ہے' لہٰذا فرانس موجود ہے۔ کبھی کسی خطے میں ایسی کوئی مشترک کیفیت ہوتی ہے کہ اس پر ایک ملک بن جاتا ہے' یا کسی ملک کا کوئی تاریخی

وجود ہے‘ مثلاً مصر پانچ ہزار سال سے موجود ہے۔لیکن ہمارے ہاں عجیب صورتحال ہے‘ بایں طور کہ یہاں زبانیں مختلف ہیں‘ نسلیں مختلف ہیں‘ حتیٰ کہ ڈریس کوڈ مختلف ہے۔ایک پشتون عورت ایک بنگالی عورت کے لباس کو دیکھے تو وہ اسے نیم برہنہ کہے گی۔ بنگلہ دیش تو لسانیت کی بنیاد پر بنا‘ لیکن اس سے پہلے کے مشرقی پاکستان کو شامل کر کے دیکھیں تو ہمیں کتنی diversity نظر آئے گی۔موجودہ پاکستان سمندر کے کنارے ہے‘ جس کے اوپر پہاڑ‘ درمیان میں صحرا‘ جنگلات اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ان مختلف لوگوں کو جن کی ثقافت مختلف‘ زبانیں مختلف‘ رنگ مختلف اور خطے مختلف تھے‘ جمع کرنے والی شے اللہ کا کلمہ تھا۔ چند سال پہلے یومِ آزادی کے موقع پر ایک بڑا اچھا میسج ملا کہ ’’قیامِ پاکستان کے موقع پر ایک قوم تھی‘ جس کو ایک ملک کی تلاش تھی۔ آج ملک کو قوم کی تلاش ہے‘‘۔اُس وقت قوم شیعہ‘ سُنّی‘ دیوبندی‘ بریلوی‘ پنجابی بنگالی کم تھی‘ مسلمان زیادہ تھی۔آج صورت حال مختلف ہے۔لیکن یہ ملک تب ہی قائم رہے گا جب اس کی بنیاد مستحکم ہوگی اور وہ بنیاد فقط اسلام ہے۔

علامہ اقبال اور پاکستان کا بیانیہ

اب میں آپ کے سامنے چند حوالے رکھنا چاہوں گا جس سے ثابت ہوگا کہ پاکستان کے بیانیہ کی بنیاد اسلام ہے۔علامہ اقبال کے حوالے سے یہ بات معروف ہے کہ اقبال کی شاعری سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو جذبہ پیدا ہوا اس کے قریب بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔یہی علامہ اقبال ہیں جنہوں نے ’’اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے‘‘ جیسے کلام بلکہ بیانیے کے ذریعے سے مسلمانوں میں ملی جذبہ پیدا کیا۔یہ وہی علامہ اقبال ہیں جن کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد بہت مشہور ہے۔گزشتہ دنوں ایک سیکولر شخص سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک ایسی پھلجھڑی چھوڑی جس کو سن کر یقیناً آپ کو بھی ہنسی آئے گی۔انہوں نے کہا کہ تم لوگ علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کی بہت بات کرتے ہو‘ حالانکہ اس اجلاس کا تو کورم ہی پورا نہیں تھا‘ جس کی وجہ سے وہ اجلاس سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔بعض اوقات مخالفت میں لوگ اس قدر آگے چلے جاتے ہیں۔ بہرحال خطبۂ الٰہ آباد کوئی وحی تو نہیں تھا‘ لیکن یہ بات یقیناً مضحکہ خیز ہے کہ کورم ہی پورا نہیں تھا اور جلسہ ہی نہیں ہوا تو ان کا خطبہ کہاں سے آ گیا؟ گویا ستر برس سے ہمارے ساتھ مذاق ہوتا رہا۔

اس خطبے میں علامہ اقبال نے کہا تھا: ’’میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں الگ مسلم مملکت کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔اسلام کے لیے یہ ایک موقع ہوگا کہ عرب ملوکیت کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے تھے‘ ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین‘ تعلیمات اور ثقافت کو ان کی اصل روح کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے‘‘۔ان کے کلام میں سے ایک مثال دیکھئے:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

قائداعظم یہاں سے مایوس ہو کر لندن چلے گئے تھے تو یہی اقبال تھے جنہوں نے قائد اعظم کو خطوط لکھے‘ تب وہ واپس آئے اور تحریک پاکستان کی قیادت کی۔

قائداعظم اور پاکستان کا بیانیہ

علامہ اقبال کے بعد اس ضمن میں اب میں قائداعظم کے چند ارشادات آپ کے سامنے

رکھوں گا۔ قائداعظم کے حوالے سے چار جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ۱۹۸۸ء میں بینظیر بھٹو کے دور میں ''The Voice and Speeches of the Quaid'' کے نام سے وزارتِ اطلاعات کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کتاب سے چند اقتباسات میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ۱۳ جنوری ۱۹۳۸ء کی بات ہے' انہوں نے فرمایا: ''مسلم لیگ کا جھنڈا اسلام کا جھنڈا ہے''۔ ۲۲ نومبر ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''اسلام کا قانون بہترین قانون ہے''۔ ۷/اگست ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''میں اول و آخر مسلمان ہوں''۔ ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو فرمایا: ''انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے''۔ ۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو فرمایا: ''ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں''۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو فرمایا: ''میرا پیغام قرآن ہے!''

ہمارے سیکولر حضرات جو اپنے تئیں مضبوط دلیل پیش کرتے ہیں وہ قائداعظم کی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر ہے۔ اس کے بارے میں جو ڈراپ سین ہوا ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ کی ایک خاتون صحافی سیلینہ کریم نے اس پر ریسرچ کی ہے اور برٹش لائبریری کھنگال ڈالی ہے' لیکن انہیں اس تقریر کا اصل متن کہیں نہیں ملا۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم مان بھی لیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ''کوئی ہندو' ہندو اور کوئی مسلمان' مسلمان نہیں رہے گا''— جس شخص نے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد میں سینکڑوں مرتبہ اسلام کی بات کی ہے' اس کے خیالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس میں حرج کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ایک مسلم ریاست میں کوئی غیر مسلم اس کی بالادستی قبول کر کے رہ سکتا ہے' اس کو تمام شہری حقوق ملیں گے۔ وہ ایک ٹیکس جزیہ کی صورت میں ادا کرے گا اور اس کے عوض اسے جان' مال' عزت و آبرو' عبادات وغیرہ کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اس تقریر کو جو قابل بحث بن چکی ہے' اگر مان بھی لیا جائے تو اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دو ٹوک انداز میں فرمایا: ''اسلامی اصول آج بھی ہماری زندگی کے لیے اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح ۱۳۰۰ سال پہلے قابل عمل تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ لوگوں کا ایک گروہ جان بوجھ کر فتنہ اندازی سے یہ بات کیوں پھیلانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر مدوّن نہیں کیا جائے گا''۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب جو قائداعظم کے ذاتی معالج تھے' کی تحریر ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے کہا کہ قائداعظم وفات سے دو تین

روز قبل بڑی دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے' جسے ہم نے کان لگا کر سنا۔ قائداعظم فرما رہے تھے:

''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا جو میں اکیلا کبھی نہ کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسولِ خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔''

اس فرمان کے آخری دو نکتے دراصل ترجمانی ہے سورۃ النُّور کی آیت ۵۵ کی' جس میں فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪﴾

''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' کہ اللہ ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی تھی۔''

قائداعظم کی ایک اور تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انہوں نے اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں: ''مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے انسانوں کو غلام بنا کر چھوڑا ہے' اللہ نے ہمیں موقع دیا اور میں پوری توجہ کے ساتھ دیکھوں گا کہ کس طرح ہم اسلام کے عادلانہ نظام کی تعلیمات پر مبنی ایک معیشت کا نظام دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں''۔ یہ تقریر اسٹیٹ بینک کی ویب سائٹ پر موجود تھی لیکن اب وہاں سے ہٹا دی گئی ہے' جیسے علامہ اقبال کے کلام کو نصابِ تعلیم سے نکالا جا رہا ہے۔ جب اسلام کو نصابِ تعلیم سے نکالا جا رہا ہے تو قائداعظم اور علامہ اقبال کو نکالنا ان کے لیے کوئی اہم بات کب ہو سکتی ہے۔

یہ معمارانِ پاکستان کی چند تقاریر کے اقتباسات ہیں۔ باقی مسلمانانِ برصغیر کی جِدّوجُہد کی ایک مکمل تاریخ ہے اور کراچی میں رہنے والوں سے زیادہ اس تاریخ کو اور کون جانتا ہوگا۔ اس نسل کے چند لوگ ہی رہ گئے ہوں گے جو آگ اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں پہنچے تھے۔ کتنی عصمتیں لٹیں' کتنی جانیں گئیں' کتنے نوجوانوں کے لاشے اٹھائے گئے' کتنے بوڑھوں کو شہید کیا گیا! یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم نے دعا کی تھی: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایک خطۂ زمین عطا فرما جہاں ہم تیری اور تیرے رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں گے۔''

ملک کا دستور اجتماعی بیانیہ کی حیثیت رکھتا ہے!

اب ذرا موضوعِ سخن بیانیہ پر بھی کچھ گفتگو کر لیتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے جو کچھ تحقیق کی اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی ادارہ‘ تحریک‘ کوئی اجتماعیت یا کوئی ریاست جب کوئی اقدامات کرنے لگے تو اس کے لیے کچھ نظریات پیش کرتی ہے‘ جیسے کسی منشور کو اجمالی طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ہمارے پیش نظر یہ کچھ ہے۔

اس پر ایک بہت خوبصورت کلام پڑھنے کو ملا کہ ملکی سطح پر بیانیہ کیا ہوسکتا ہے؟ کسی دین کا درد رکھنے والے نے لکھا ہے کہ اصولی طور پر ملک وقوم کا دستور اجتماعی بیانیہ ہوتا ہے۔ اگر اس تناظر میں بات کی جائے تو ہمارے پاس بڑی وزنی باتیں موجود ہیں۔ ہمارے پاس قراردادِ مقاصد موجود ہے جو ہر آئین کا حصہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس اہل علم کے اجماع اور اتفاق سے ملکی سطح پر نفاذِ اسلام کے لیے بائیس نکات موجود ہیں۔ ہمارے پاس آئین کی کچھ دفعات یا آرٹیکلز موجود ہیں جو اسلام کی بات کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دستور میں کچھ چور دروازے بھی موجود ہیں۔ دستور میں اسلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا موجود ہے جس کے ذریعے گویا اس کو کلمہ پڑھایا گیا ہے‘ لیکن اس پر عملدرآمد نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بے نمازی ہے‘ سود بھی کھاتا ہے‘ غیبت بھی کرتا ہے‘ حرام کا لقمہ بھی ہضم کر جاتا ہے‘ لیکن ہے تو کلمہ گو مسلمان۔ اسی طرح پاکستان کا دستور بھی مسلم ہے مگر اس کی روح کے مطابق قانون سازی نہیں ہو رہی ہے۔

اس تناظر میں ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہمارے ہاں بیانیے کی رٹ کب شروع ہوئی۔ کہا گیا کہ کچھ لوگ دہشت گردی میں ملوث ہو رہے ہیں‘ انہوں نے اسلحہ اٹھا رکھا ہے‘ وہ ریاستی اداروں کے خلاف سرگرم عمل ہیں‘ چنانچہ ان کے خلاف کچھ اقدام کا معاملہ ہونا چاہیے۔ ضربِ عضب اور ردّ الفساد جیسے آپریشنز ہوئے۔ اس ضمن میں ایک بحث شریعت کے نام پر شروع ہوگئی کہ کیا شریعت میں مسلح بغاوت کی گنجائش ہے؟ فقہاء بیان کرتے ہیں کہ مسلمان معاشرے میں اس کی گنجائش نہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے دہشت گردی شروع کر دی اور کہا گیا کہ یہ مذہبی دہشت گرد ہیں۔ بیانیہ کے حوالے سے شریعت پر کام شروع ہوگیا تاکہ ان دہشت گردوں کے خلاف ہمارا اقدام قانونی حیثیت اختیار کر لے۔ اس پر ایک صاحب نے بڑا پیارا

تبصرہ کیا کہ پھر ان دہشت گردی کرنے والوں کے حوالے سے مذہب ہی کا نام زیر بحث کیوں آ رہا ہے؟ بلوچستان میں جو لوگ دہشت گردی کر رہے ہیں تو کیا ان کے لیے بھی آپ کوئی بیانیہ لائیں گے؟ یا ان کے لیے کوئی بیانیہ لانے کی بات کی گئی ہے؟ کیا ان پر بھی آپ نے کوئی لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کی؟ حاصل یہ کہ بیانیے کی بحث چھیڑ کر دین پر بحث شروع ہوگئی۔

غامدی صاحب کا جوابی بیانیہ

چونکہ ہماری افواج کو اقدام کرنا تھا اور بات حکومت کے سر پر آ گئی تھی تو کسی بیانیے کی ضرورت پیش آئی تو ایک جوابی بیانیہ غامدی صاحب کی جانب سے آ گیا۔ اس میں انہوں نے اسلام کے مسلمات پر حملے شروع کر دیے۔ انہوں نے جو تفاصیل پیش کیں ان پر الحمد للہ مفتی تقی عثمانی صاحب کی طرف سے بہت عمدہ مضمون آیا اور مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے دو مضامین آئے۔

غامدی صاحب کے جوابی بیانیے کی جڑ اور بنیاد میں کیا اُٹھان تھی‘ اس کو بیان کر دوں۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملے کو ہلکا نہ لیں‘ یہ تو سارے پاگل ہیں‘ ان لوگوں نے اسلام کی من چاہی تعبیرات شروع کر دی ہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں کہ ریاست کی سطح پر یہ دین کی بات کریں۔ ان کی دو باتیں میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا از روئے شرع کہیں مطلوب نہیں۔ اسی کی ترجمانی سادہ انداز میں سیکولر طبقہ کرتا ہے کہ مذہب کو ریاستی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لبرلز کہتے ہیں کہ مذہب تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

It is nothing to do with state affairs.

حالانکہ اسلام مذہب نہیں ہے اور یہ ذاتی معاملات تک محدود نہیں‘ بلکہ اسلام ایک دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے احکام کے نفاذ کے لیے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہے۔ یہ فقہاء کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ قوتِ نافذہ مانگی ہے۔ اس حوالے سے حضور اکرم ﷺ کی بہت سی دعائیں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایسی دعا مانگی تھی جو سورۂ بنی اسرائیل میں آئی ہے: ﴿رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾﴾ ”اے میرے رب! مجھے داخل کر سچائی کے ساتھ داخل کرنا اور مجھے نکال سچائی کے ساتھ نکالنا اور اپنی جناب سے مجھے قوت

عطا فرما جس کے ذریعے غلبہ حاصل ہو۔''

دوسری بات یہ کہ غامدی صاحب ایک جانب تو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مساجد پر ریاست کا کنٹرول ہونا چاہیے' حکمرانوں کو نماز کی امامت کرنی چاہیے۔ جب مذہب کا ریاست سے تعلق ہی نہیں تو وہ مذہبی کام کیوں کرے؟ اس بارے میں وہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ غالب ہے اور پارلیمنٹ چاہے گی تو نماز و زکوٰۃ کے بارے میں فیصلے کرے گی۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب آپ کے نزدیک مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں تو پارلیمنٹ ان معاملات میں کیوں دخل اندازی کرے؟

پھر غامدی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے اور اس کا قیام بھی کوئی دینی تقاضا نہیں ہے۔ اس کا جواب بھی مفتی تقی عثمانی صاحب' مفتی منیب الرحمٰن صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب نے دیا اور اور یا مقبول جان صاحب نے دو ایک کالم اس پر لکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا کلام خلافت کی تاریخ اتنی ہی پرانی بتاتا ہے جتنی انسانی تاریخ ہے۔ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پہلے نبی اور پہلے خلیفہ تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا''۔ زمین پر اللہ تعالیٰ کے نمائندے انبیاء کرام علیہم السلام تھے اور ختم نبوت کے نتیجے میں اب یہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ زمین پر اللہ کی مرضی کو نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ ابن خلدون نے خلافت کی تعبیر یہ کی ہے کہ رب کی زمین پر اس کی مرضی کو جاری و ساری کرنا خلافت ہے۔ امام ماروندی صاحب فرماتے ہیں کہ دین کی حفاظت اور دنیا کی ریاست و سیاست خلافت ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے بہت سادہ انداز میں سمجھایا کہ وہ تمام امور جو نبی اکرم ﷺ انجام دے رہے تھے' اب ختم نبوت کے بعد آپ ﷺ کے تمام امور میں ان کی نیابت کرنا خلافت کی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کسی نے ''خلیفۃ اللہ'' کہا تو آپؓ نے فرمایا: نہیں میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ ''خلیفۃ الرسول ﷺ'' ہوں۔ یہ بات پوری امت سمجھتی ہے' لیکن غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں۔ یہ ان کا اس بیانیے کا جوابی بیانیہ تھا۔ ان کے اس جوابی بیانیے پر کچھ لوگوں کو مہمیز ملی اور اس ضمن میں پھلجھڑیاں جاری ہیں۔ سیکولر اور لبرل عناصر اس میں پیش پیش ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کو ایک لبرل اور سیکولر ریاست ہونا چاہیے۔ یہ وہی بات ہے جو

ہمارے سابق وزیراعظم نے کہی تھی کہ ہم پاکستان کو لبرل ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ یہ اس ملک کی جڑیں کھودنے والی بات ہے۔ اگر آپ لبرل اور سیکولر کی اصطلاح کو جاننا چاہیں تو اسے انگریزی لغت میں تلاش کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات facts اور figures کی بنیاد پر ہوگی' اسے مانا جائے گا' بجائے اس کے کہ ہم کسی آسمانی وحی کی بنیاد پر مانیں۔ یہ تو واضح طور پر وحی الٰہی کا انکار ہے۔

پیغامِ پاکستان: ایک نیا بیانیہ

پیغامِ پاکستان' جس کا میڈیا میں بھی بہت تذکرہ ہوا اور اب اسے ایک متفقہ بیانیہ کہا جا رہا ہے' پر گفتگو کی جانب آتے ہیں۔ اس کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔

پہلا حصہ: اس کا ایک حصہ وہ ہے جس میں ریاستی اداروں نے اپنا ایک بیانیہ پاکستان' اس کے منظر' اسلام' حقوق' روحانیت' معاشرت' اخلاق کے بارے میں پیش کیا' مگر ریاستی سطح پر دین کے احکامات کے حوالے سے ڈنڈی ماری گئی۔ اس میں یہ بات بھی کہی گئی کہ پاکستان وہ اسلامی ریاست ہے جہاں قرارداد مقاصد بھی موجود ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین ہمارا مستقبل کا لائحہ عمل ہے جس میں اسلامی دفعات بھی موجود ہیں۔ اس ملک میں وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل بھی موجود ہے۔ اس ملک میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کا کردار بھی بہت مثبت ہے۔ ان اداروں نے اسلام کے حوالے سے بڑا کام بھی کیا ہے۔ ان سب باتوں کے حوالے سے کوئی دو رائے موجود نہیں۔ دستور میں قرارداد مقاصد درج ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں کچھ اسلامی دفعات بھی موجود ہیں۔ دفعہ ۳۱ میں لکھا ہے کہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ یہاں کے باشندوں کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر دین کی تعلیمات پر عمل کرائے۔ لیکن ان کو سکھانا پڑے گا کہ دین پر عمل کس طرح کیا جائے؟ اسلامی نظریاتی کونسل کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے چیئرمین کا تقرر سیاسی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بہت قابل علماء حضرات ہیں' مگر ان کی تحقیقات اور سفارشات کہاں ہیں؟ وہ سب سرد خانے میں پڑی ہوئی ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت نے ۱۹۹۱ء میں فیصلہ دیا تھا کہ بینک انٹرسٹ ''ربا'' ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کے خلاف عدالتی کارروائی میں ایک جج نے کہا کہ جس کو سود نہیں لینا وہ نہ لے' اور جو لے گا اس سے اللہ پوچھ لے گا۔ پھر کیس شرعی عدالت کو واپس چلا گیا۔ گویا اسے

پنگ پانگ کا ایک کھیل بنا دیا گیا جو تا حال جاری ہے۔

دوسرا حصہ: دوسرے حصہ میں علماء سے فتویٰ مانگا گیا۔ اس میں تین چار سوالات تھے: کیا پاکستان اسلامی ریاست ہے؟ کیا یہاں کی حکومت اور فوج کے خلاف جو کارروائیاں ہو رہی ہیں‘ حرام نہیں؟ کیا خودکش حملے کرنا حرام نہیں؟ کیا قتال حکومت کی ذمہ داری نہیں؟ علماء کی طرف سے تمام سوالات کے مثبت جوابات آ گئے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ حکومت اور فوج کے خلاف کارروائیاں کرنے والوں کے خلاف اقدام کرنا حکومت کا حق ہے۔ خودکش حملے بھی حرام ہیں۔ حکومت کے خلاف مسلح بغاوت فساد فی الارض کے ذیل میں آتی ہے۔ متفقہ فتوے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شریعت کے نفاذ کے لیے پُرامن طور پر جدوجہد کرنا‘ باشندگانِ پاکستان کا بنیادی حق ہے۔ وضاحتی نوٹ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا ہے کہ ’’جو لوگ دہشت گردی میں ملوث ہیں‘ خارجی قسم کے لوگ ہیں۔ یہ تکفیری سوچ رکھنے والے ہیں اور ان کے خلاف اقدام ضرور ہونا چاہیے۔‘‘ اس متفقہ فتوے پر ۱۸۲۹ علماء کے دستخط ہیں۔

پیغامِ پاکستان کا جائزہ

کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ ایک متفقہ دستاویز ہے جس میں ایک حد تک معتدل بات تو آئی ہے‘ لیکن اس ادنیٰ انسان کی حکومت پاکستان سے بصد ادب سے درخواست یہ ہے کہ آپ پاکستان کو اسلامی ریاست تسلیم کرتے ہیں تو اسلام کیا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ قرارداد مقاصد بھی موجود ہے اور ۷۳ء کا آئین بھی موجود ہے تو کیا اس ملک میں اللہ کی حاکمیت ہے؟ کیا یہاں سارے قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہیں؟ علماء کرام سے بھی بصد ادب درخواست ہے کہ وہ یہ تو بتائیں کہ ریاست جو حرکتیں کر رہی ہے‘ مثلاً قرآن وسنت کے خلاف قوانین جاری کر رکھے ہیں‘ ریاست کی اجازت سے یہاں سود کے دھندے بھی جاری ہیں اور فحاشی کا کاروبار بھی عروج پر ہے۔ اسی طرح ریاست نے افغانستان کے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو شہید کرنے کے لیے ۵۷ ہزار پروازوں کو پاکستان کی سرزمین سے اُڑنے کی اجازت دی‘ ان امور کے بارے میں آپ کا فتویٰ کیا ہے؟ پرامن طور پر شریعت کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنا ہمارا بنیادی حق ہے تو علماء کرام اس جدوجہد کی قیادت بھی تو فرمائیں۔ لال مسجد والوں کے بارے میں درست کہا گیا کہ ان کا طریقۂ کار غلط تھا‘ تو صحیح طریقہ کیا ہے‘ یہ تو بتا دیں۔

اگر پانچوں وفاق المدارس نہیں تو کم از کم مکتبۂ دیوبند جن کا وفاق سب سے بڑا ہے‘ جن کے مدارس پاکستان میں سب سے زیادہ ہیں‘ وہی اس کا جواب بتا دیں۔ جس سال اپریل میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا انتقال ہوا‘ انہی دنوں مکتبہ دیوبند کے ڈھائی سو علماء جامعہ اشرفیہ میں موجود تھے۔ اس اجتماع کے اعلامیہ پر ہی توجہ فرما لیں جس کی تحریر مفتی تقی عثمانی صاحب نے پیش کی تھی اور جسے مولانا زاہد الراشدی صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کے مسائل کی سب سے بڑی وجہ یہاں اللہ تعالیٰ کی شریعت کا نافذ نہ ہونا ہے۔ اس ملک میں کوئی مسلح بغاوت جائز نہیں‘ لہٰذا ہمیں پُرامن طور پر شریعت کے نفاذ کا مطالبہ لے کر کھڑا ہونا چاہیے۔

نفاذِ اسلام کے لیے پُرامن تحریک کی ضرورت

الحمدللہ‘ تنظیم اسلامی برسوں سے یہ بات کہہ رہی ہے کہ ہمیں نفاذ شریعت کے لیے پرامن منظم تحریک چلانی چاہیے۔ یہ جدوجہد صرف ہمارا حق نہیں‘ فرض ہے۔ اس کا اظہار تو فرمائیں۔ اس کے لیے میدانِ عمل میں آئیں۔ آپ اس جدوجہد کے امام بنیں‘ ہم ان شاء اللہ آپ کی اقتدا میں قدم اٹھائیں گے۔ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں نے گزشتہ ستر سال سے انتخابی سیاست کے دلدل میں قدم رکھا ہوا ہے۔ اب انہیں دس سیٹیں بھی نہیں ملتیں۔ اللہ کرے انہیں سمجھ آ جائے۔ خدارا وہ شریعت کے نفاذ کے لیے پُرامن تحریک چلائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی تحریکوں کو کامیابیاں عطا فرمائی ہیں۔ ختم نبوت کی تحریک سڑکوں پر بھی چلی اور پارلیمنٹ میں بھی کارروائی ہوئی۔ ناموسِ رسالت ﷺ کا معاملہ آیا تو تحریک چلی اور پیپلز پارٹی کے دور میں جو بل دفعہ ۲۹۵C کے خلاف آنا تھا وہ رک گیا۔ ناموسِ رسالت ﷺ ہمارے عقیدے کا معاملہ ہے۔ تاہم ناموسِ الٰہی بھی کسی شے کا نام ہے یا نہیں؟ سورۂ نوح میں ارشاد ہوا: ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾﴾ ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ اللہ کے وقار کا تمہیں کوئی پاس نہیں ہے؟‘‘ ایک سیاستدان الطاف حسین کے خلاف جب ذوالفقار مرزا نے بیان دیا تھا تو اس نے پورے کراچی میں آگ لگا دی تھی۔ زرداری صاحب کی شان میں اگر کوئی کچھ کہہ دے تو پیپلز پارٹی کھڑی ہو جاتی ہے۔ کسی اہلِ علم کے بارے میں کوئی بات ہو تو مدرسے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کراچی کو سیاسی جماعتوں نے بھی اور مدارس والوں نے بھی ہلاک کیا ہے۔ ہم اللہ کی شریعت کے لیے کب کھڑے ہوں گے؟ اللہ عزوجل کی کوئی ناموس ہے کہ نہیں؟ اس کی شریعت کی کوئی

حیثیت ہے کہ نہیں؟ کیا اتنی بھی نہیں جتنی لوگوں کے لیے بجلی‘ گیس اور پانی کی حیثیت ہے؟ جب کوئی ناروا ٹیکس لگتا ہے تو کراچی کے تاجر ہڑتال کر دیتے ہیں۔ کیا اللہ کا دین اور اس کی شریعت کا کوئی والی وارث نہیں؟ جو ملک اسلام کے نام پر بنا تھا‘ یہ اگر بچے گا تو اسلام کے نام پر ہی بچے گا۔ پاکستان کی بنیاد ہی اسلام ہے اور اگر اسلام کمزور ہو تو ملک کہاں ہوگا؟ ہم نے ستّر سال میں کوئی سبق نہیں سیکھا‘ حالانکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں لسانیت کی بنیاد پر آدھا ملک ہم نے گنوا دیا۔ اب بھی ہم نے اگر ہوش کے ناخن نہ لیے تو پھر اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہماری ذمہ داری سامنے آ چکی ہے۔ اسلام کے حوالے سے پہلے ہمیں خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ میرے اپنے وجود پر اللہ کا دین غالب ہے یا نہیں! پھر اسی کی دعوت کو عام کرنا ہے اور اسی کے نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے میدانِ عمل میں نکلنا ہے۔ اسی پیغام کو ہم عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی پر اللہ کی نصرت کا وعدہ ہے‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ ’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو مضبوطی عطا فرمائے گا‘‘۔ بقول شاعر ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

تصحیح

گزشتہ شمارے میں مولانا محمد جہان یعقوب کا مضمون ’’بیت المقدس اور فلسطین پر قبضے کی یہودی منصوبہ بندی‘‘ شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۲۷ پر دوسرے پیراگراف میں ’’ہرزل‘‘ کی جگہ غلطی سے ’’ہٹلر‘‘ شائع ہو گیا ہے‘ جسے درست کر لیا جائے۔ یہ عالمی صہیونی تحریک کا بانی تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) تھا جس نے ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید کو اپنے دامِ فریب میں لانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

ذکر اللہ کی اہمیت وفضیلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان دو چیزوں کا مرکب ہے' ایک خاکی جسم اور دوسری روح۔ دونوں چیزوں کو خوراک کی ضرورت ہے۔ جسم مٹی سے ہے اور اس کی غذا بھی زمین سے اُگنے والی پیداوار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی خوراک میں گوشت شامل ہے جو ان جانوروں سے حاصل ہوتا ہے جو زمینی پیداوار سے کھاتے ہیں۔ یوں انسان کے مادی وجود کا تعلق زمین سے ہے۔ مرنے کے بعد انسان پھر مٹی میں جاملتا ہے۔

انسان کا دوسرا جزو روح ہے۔ روح لطیف شے ہے' یہ نظر نہیں آتی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ روح اللہ کا امر ہے۔ روح کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔ چونکہ انسان کا جسم کثیف ہے لہٰذا اس کی غذا بھی مادی چیزوں پر مشتمل ہے' مگر روح ایک لطیف شے ہے تو اس کو لطیف غذا کی ضرورت ہے۔ جسم اور روح کی غذاؤں کے تقاضے ایک دوسرے سے اُلٹ ہیں۔ جسمانی غذائیں انسانی جسم کو فربہ اور طاقتور بناتی ہیں' مگر ان کا ضرورت سے زیادہ استعمال انسانی روح کو پژمردہ' کمزور اور مضمحل کرتا ہے۔ بلاشبہ زندہ رہنے کے لیے جسم کو خوراک کی ضرورت ہے' مگر دانش مندی یہ ہے کہ انسان اسی قدر غذا کھائے جو اس کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ اگر انسان ضرورت سے زیادہ خوراک کھائے گا تو اس کا وجود تو توانا ہو جائے گا مگر روح کمزور ہوتی جائے گی' کیونکہ مادی غذا روح کو صحت مند نہیں بناتی۔ روح مادی نہیں ہے' اس لیے اس کی غذا بھی مادی نہیں ہے۔ روح امرِ ربّی ہے اور اللہ کا ذکر ہی اس کی غذا ہے۔ اسی لیے دانش مند کہتے ہیں کہ انسان کو اسی قدر خوراک لینی چاہیے جو اس کی زندگی کو برقرار رکھے' کیونکہ کھانا تو زندہ رہنے کے لیے کھایا جاتا ہے نہ کہ زندگی کھانے پینے کے لیے ہے۔ سنت بھی یہی ہے کہ کھانا کھاؤ تو اس طرح کہ ابھی بھوک باقی ہو تو چھوڑ دو۔ اور کھاؤ بھی اس وقت جب

کھانے کی ضرورت ہو۔ ہر وقت کا کھانا اور بے تحاشا کھانا جسمانی بیماریوں کا باعث بھی بنتا ہے اور اس طرح بندے کی روح تو دب کر رہ جاتی ہے۔

ایک اچھے انسان کا طرزِ عمل تو یہ ہونا چاہیے کہ جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اسے اپنی روحانی صحت کا بھی خیال رہے اور یہ خیال وہ کبھی بھی فراموش نہ کرے' بلکہ ہر وقت اسے یہ خیال دامن گیر رہے کہ اس کی روح کی اچھی پرورش ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اس بات کا ٹیسٹ یہ ہے کہ اگر اسے اطمینانِ قلب نصیب ہے تو وہ سمجھ لے اس کی روحانی صحت اچھی ہے' کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸﴾ (الرعد) ''یاد رکھیے! دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔''

روزے میں انسان کے جسم پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں' جب کہ اس کی روح کی غذا کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے' جس سے روح تقویت حاصل کرتی ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ سراسر اللہ کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر) ''ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ گویا حقیقی' سچا اور مستند ذکر تو قرآن مجید ہی ہے۔ جو شخص اپنی روح کو قرآن مجید سے خوراک پہنچا رہا ہے' صحیح معنوں میں وہ سچا اور حقیقت پسند شخص ہے۔ اسی کو صحت مند کہنا چاہیے' خواہ وہ بظاہر کتنا ہی نحیف ونزار ہو۔ رمضان اور قرآن کا باہم خاص تعلق ہے اور رمضان المبارک کے دوران تلاوتِ قرآن کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے۔'' گویا نماز بھی اللہ کا ذکر ہے۔ اگر کسی کا تعلق قرآن کے ساتھ قائم ہو گیا اور نماز کی پابندی کو اس نے قیمتی متاع بنا لیا تو اس کے بعد اللہ کے حکموں کی پابندی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے اذکار کا معمول اسے کامیاب انسان بنا دے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے چند اذکار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث کی کتابوں میں اور بھی مسنون اذکار ہیں جن کو حسبِ استطاعت اپنانا فلاح وکامیابی کا یقینی ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان میں سے ایک صرف اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مَردوں اور عورتوں کے لیے خاص ہے''۔ (عن ابن عباسؓ) ذکر

اللہ میں غفلت آخرت میں افسوس کا باعث ہوگی' کیونکہ اُس دن ذکر اللہ کا انعام سامنے آجائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں داخل ہوجانے کے بعد اہلِ جنت کو دنیا کی کسی چیز پر قلق نہیں ہوگا بجز اس گھڑی کے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گزری''۔ (عن معاذ بن جبلؓ۔ رواہ الطبرانی والبیہقی)

رسول اللہ ﷺ نے ذکر اللہ کی فضیلت بتاتے ہوئے فرمایا: ''جس وقت تم جنت کے باغات کے پاس سے گزرو تو ان کے پھل خوب کھایا کرو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ جنت کے باغات کون سے ہیں؟ فرمایا: ''ذکر الٰہی کے حلقے''۔ (عن انسؓ۔ رواہ الترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کو افضل الذکر اور ''الحمد للہ'' کو تمام دعاؤں سے افضل قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ مجھے کوئی ورد تعلیم فرمائیے جس سے میں آپ کو یاد کروں اور پکارا کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لا الٰہ الا اللہ کہا کرو۔ عرض کیا: اے میرے پروردگار! یہ تو ساری دنیا کہتی ہے۔ ارشاد ہوا: لا الٰہ الا اللہ کہا کرو۔ موسیٰؑ نے عرض کیا: اے میرے رب! میں تو ایسی چیز مانگتا ہوں جو میرے لیے خاص ہو اور مجھ ہی کو عطا ہو۔ فرمایا: ''اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور دوسری طرف لا الٰہ الا اللہ رکھ دیا جائے تو لا الٰہ اِلا اللہ والا پلڑا بھاری ثابت ہوگا''۔ (رواہ فی شرح السنہ) رسول اللہ ﷺ کے بیان فرمودہ بابرکت کلمات تو بہت ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دو کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں۔ زبان پر بہت ہلکے اور ترازو میں بھاری ہیں' وہ کلمات ہیں: **سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ**'' (عن ابی ہریرہ فی البخاری) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان صبح و شام ان کلمات کو تین مرتبہ کہے تو اللہ تعالیٰ پر لازم ہوگا کہ وہ قیامت کے دن اس مسلمان کو راضی کرے۔ وہ کلمات یہ ہیں: **رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا**'' (عن ثوبانؓ۔ رواہ احمد والترمذی)

یاد رہے کہ مسنون اذکار کو چھوڑ کر انسانوں کے مرتب کردہ اذکار مفید نہیں ہوسکتے' کیونکہ مسنون کی موجودگی میں غیر مسنون کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اسی طرح روحانی صحت کے لیے نام نہاد پیروں اور درویشوں کے پیچھے بھاگنے اور ان سے عجیب طرح کی ہدایات لینا بھی مفید

نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں کسی طرح کی تکلیف دہ مشقتیں نہیں ہیں۔ چلّہ کشی کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ نفلی روزے تو مسنون ہیں مگر اس کے علاوہ کئی کئی دن بھوکا رہنا اور جسم کو خواہ مخواہ کی تکلیفوں میں ڈالنا بھی سنت سے ثابت نہیں ہے۔ جس طرح ہر جگہ دھوکے باز اور فراڈیے مل جاتے ہیں' یہاں بھی گمراہی بانٹنے والے الٹے سیدھے بھیس بنا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے مشکل کاموں کو دیکھ کر لوگ ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میرا بتایا ہوا یہ وظیفہ قبرستان میں جا کر رات کو پڑھنا ہے یا پانی میں کھڑے ہو کر دو ہفتے پڑھنا ہے' مگر کوئی بندہ جس کا قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ پر پختہ ایمان ہے وہ ان نام نہاد پیروں کے ہتھے نہیں چڑھے گا۔ اگر انسان قرآن اور حدیث ہی کو اپنا راہنما بنا لے تو اس کے لیے گمراہی کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) ''بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے اصحاب کی زندگیوں میں کوئی ایسی نئی یا انوکھی پریکٹس نہیں ملتی جو آپؐ کے عمل میں نہ ہو۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ زبانِ رسالت سے بڑھ کر کوئی زبان مستند نہیں ہوسکتی۔ جس کسی نے فیض پایا ہے وہ حضور ﷺ کے طریقے اپنا کر ہی پایا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

''جس کسی نے بھی پیغمبر ﷺ کے خلاف راہ اختیار کی وہ ہرگز منزل تک نہیں پہنچ پائے گا۔''

ترسم کہ بکعبہ نہ رسی اے اعرابی
کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است!

سچ ہے ترکستان کے راستے کی طرف چل کر کوئی کعبہ شریف کیسے پہنچ سکتا ہے۔ کعبہ شریف تو وہی پہنچے گا جو اس کی طرف رخ کرے گا۔

مسنون اوراد و وظائف حدیث کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں' انہی کو اختیار کرنے میں سلامتی ہے۔

❁❁❁

شوال کے روزے: فضیلت اور احکام

پروفیسر عبدالعظیم جانبازؔ ☆

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مسلمان کو تمام قسم کے نیک اعمال پر ہمیشگی اور تسلسل کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیے اور تزکیۂ نفس پر انتہائی حریص ہونا چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی مقصد کے لیے عبادات متعین فرمائی ہیں۔ انسان جس قدر ان نیکیوں کو اپنائے گا اُسی قدر تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کرتا جائے گا اور جس قدر عبادات میں سستی کرے گا اتنا ہی اس تزکیہ سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ نتیجتاً اہلِ طاعت کے دل نرم ہو جاتے ہیں اور ان ہی سے معاشرے میں اصلاح ہوتی ہے۔ جبکہ برائی کرنے والوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور وہی معاشرے میں فساد کا سبب بنتے ہیں۔

عبادات میں سے روزے کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ دلوں سے ہر قسم کا میل کچیل صاف کرتا ہے اور تمام ظاہری و باطنی امراض سے شفایابی کا باعث ہے۔ ماہِ رمضان دلوں کے جائزہ ونظر ثانی اور جانچ کا مہینہ ہے اور اس کے لیل ونہار دلوں کی پاکیزگی اور طہارت کا سبب بنتے ہیں۔ رمضان المبارک کے بعد شوال کے چھ روزوں کی مشروعیت ان مواقع میں سے ایک انتہائی قیمتی موقع ہے، جس میں روزہ دار رمضان کے روزوں سے فارغ ہو کر روزوں کی ایک اور اطاعت کو اپنا لیتا ہے، جس میں فضل عظیم اور بڑا اجر وثواب ہے۔ اس لیے کہ جو شخص رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد شوال میں چھ روزے بھی رکھتا ہے تو اس کے لیے پورے سال کے روزوں کے اجر وثواب کی نوید ہے۔

شوال کے روزوں کی فضیلت

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ)) (۱)

☆ Azeemjanbaz77@gmail.com

''جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو وہ ایسا ہے جیسے اُس نے پورے سال کے روزے رکھے ہوں۔''

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تشریح یوں بیان کی جاتی ہے کہ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الانعام: ۱۶۰) ''جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا''۔ چنانچہ رمضان المبارک کا مہینہ دس مہینوں کے برابر ہوا اور اس کے بعد چھ دنوں کے روزے سال کو پورا کر دیتے ہیں۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ: ''رمضان المبارک کے روزے دس گنا اور شوال کے چھ روزے دو ماہ کے برابر ہیں تو اس طرح پورے سال کے روزے ہوئے۔ (۲) اور انہی الفاظ کے ساتھ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے۔

حنابلہ اور شوافع فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تصریح کی ہے کہ رمضان المبارک کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنا پورے ایک سال کے فرض روزوں کے برابر ہے۔ عمومی طور پر نفلی روزوں کا اجر وثواب بھی زیادہ ہونا ثابت ہے، کیونکہ ایک نیکی دس کے برابر ہے۔

پھر شوال کے چھ روزے رکھنے کے اہم فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ یہ روزے رمضان المبارک کے روزوں کی کمی اور نقص کو پورا کرتے ہیں۔ کیونکہ روزہ دار سے حالت روزہ میں کمی کوتاہی ہو جاتی ہے اور گناہ بھی سرزد ہو جاتا ہے جو کہ روزہ کے ثواب میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری رہنمائی فرما دی کہ شوال کے چھ روزے رکھنے سے فرض روزوں میں ہونے والی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ اس طرح بندے کو چھ نفلی روزوں کا ثواب بھی مل جاتا ہے اور رمضان کے فرض روزوں کی کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ روزِ قیامت فرائض میں پیدا شدہ نقص کو نوافل سے پورا کیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''روزِ قیامت بندے کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔ ہمارا رب عزوجل اپنے فرشتوں سے فرمائے گا' حالانکہ وہ زیادہ علم رکھنے والا ہے' میرے بندے کی نمازوں کو دیکھو کہ اس نے پوری کی ہیں یا اس میں نقص ہے؟ اگر تو مکمل ہوں گی تو اس کے لیے مکمل لکھی جائیں گی' اور اگر اس میں کچھ کمی ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو میرے بندے کے کچھ نوافل بھی ہیں؟ پھر اگر اس کے نوافل بھی ہوں گے تو اللہ

تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندے کے فرائض اس کے نوافل سے پورے کردو۔ پھر اس کے باقی اعمال کا حساب بھی اسی طرح ہوگا۔‘‘(۳)

نیز رمضان کے بعد روزہ رکھنے کی عادت پڑنا رمضان کے روزوں کی قبولیت کی بھی نشانی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کا عمل قبول فرماتا ہے تو اسے مزید اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ جس شخص نے کوئی نیک عمل انجام دیا اور اس شخص کو اس کے بعد بھی عمل صالح کی توفیق مل گئی تو یہ دلیل ہوگی کہ اس کا پہلا عمل بارگاہِ ربّ العزت میں شرفِ قبولیت پا چکا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے عمل صالح کیا اور اس کے بعد پھر گناہوں کی طرف لوٹ گیا تو وہ نشانی ہے اس بات کی کہ اس کا وہ عمل قبول نہیں ہوا بلکہ ردّ کیا جا چکا ہے۔ اس بات پر اُن لوگوں کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیے جو رمضان کے روزے رکھنے کے بعد عید الفطر کے دن ہی گناہوں میں مبتلا ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ عید کی خوشی منا رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عید الفطر کا دن رمضان کے روزے رکھنے والوں کے لیے خوشی و شادمانی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن روزہ دار اپنے ربّ سے مغفرت پا لینے کی خوشی میں مسرت سے سرشار ہوتے ہیں‘ کیونکہ دنیاوی زندگی میں مغفرت سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہوتا اور اس انعام پر انہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے‘ نہ کہ رمضان گزرنے کی خوشی میں گناہوں کا ارتکاب کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا انعام پا لینے کا شکر کس طرح کیا جائے؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ہمیں بڑی واضح تعلیم دی ہے۔ حضرت اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

’’رسول اللہ ﷺ تہجد میں اتنا طویل قیام کیا کرتے تھے کہ آپؐ کے قدم مبارک سوج جایا کرتے تھے‘ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے آپؐ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اگلی پچھلی خطاؤں کو پہلے ہی معاف فرما دیا ہے۔ تو آپ ﷺ فرماتے: ((اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا)) ’’کیا میں بہت زیادہ شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں؟‘‘(۴)

چنانچہ کیا ہی اچھا ہے کہ مسلمان رمضان کے بعد مغفرت کا انعام پا لینے کے شکر میں شوال کے روزے رکھے۔ اس کے علاوہ نیکیوں کے لیے کوئی بھی موسم معین نہیں ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان اطاعتوں کو جاری وساری رکھیں حتیٰ کہ اپنے ربّ سے جا ملیں۔

کیا شوال کے روزے مکروہ ہیں؟

احناف اور مالکیہ کے کچھ علماء رحمہم اللہ نے اس صورت میں شوال کے روزوں کو مکروہ کہا ہے جب یہ اندیشہ ہو کہ عامۃ الناس میں سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ شوال کے روزے رمضان کی طرح فرض ہیں۔ دلیل کے طور پر مذاہبِ اربعہ کی چار مشہور کتابوں سے علماء کا کلام نقل کیا جاتا ہے:

(۱) احناف کے نزدیک شوال کے روزے:

’’شوال کے چھ روزے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مکروہ ہیں اور ان کی دلیل ہے کہ عامۃ الناس یہ نہ سمجھ لیں کہ شوال کے روزے رمضان کی طرح فرض ہیں۔ لیکن احناف کے مشائخ عامہ کے نزدیک شوال کے چھ روزے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان مشائخ عامہ کے بھی دو گروہ ہیں‘ ایک کہتے ہیں کہ عید الفطر کے بعد متصلاً رکھے جا سکتے ہیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ چھ روزے شوال کے مہینے میں متفرق ہی رکھے جائیں تاکہ اہلِ کتاب سے تشبّہ نہ ہو سکے۔ اوّل الذکر جواب دیتے ہیں کہ عید الفطر کے دن کے وقفہ سے اہلِ کتاب کا تشبّہ باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی شخص ان دونوں شبہات سے محفوظ رہ کر شوال کے روزے رکھتا ہے تو وارد احادیث کی روشنی میں (جو شوال کے روزوں کی فضیلت میں اوپر بیان کی گئی ہیں) روزے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔‘‘(۵)

(۲) مالکیہ کے نزدیک شوال کے روزے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شوال کے روزوں کی کراہیت کا قول منسوب ہے:

’’ان کو (یعنی شوال کے روزوں کو) امام مالکؒ نے مکروہ کہا ہے تاکہ جہلاء یہ نہ سمجھیں کہ شوال کے روزے بھی رمضان کی طرح فرض ہیں‘ لیکن جو وارد احادیث کی روشنی میں روزوں کی رغبت رکھے تو اسے منع نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ جاننے والا اور سب سے صحیح فیصلہ کرنے والا ہے۔‘‘(۶)

امام ابوعمر ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مالکی مذہب کے مشہور عالم ہیں‘ اسی بارے میں رقم طراز ہیں:

’’امام مالک رحمہ اللہ کو ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی حدیث مدنی ہونے کے باوجود نہیں پہنچی‘ کیونکہ ایک مخصوص شخص میں تمام علوم کا احاطہ ممکن نہیں۔ جن روزوں کو امام مالک نے مکروہ کہا ہے اسے انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ رمضان کے فرض روزوں کے ساتھ ملنے کا اندیشہ ہے اور عوام الناس کے لیے اسے واضح کرنا ضروری ہے۔ امام مالک دینی معاملات میں بہت زیادہ احتیاط کرنے والے شخص تھے۔ جب کہ شوال کے چھ روزے

فضیلت کے حصول کے لیے ہیں‘ جو ثوبان ؓ کی حدیث میں وارد ہوئی ہے‘ پس امام مالک انہیں مکروہ نہیں سمجھتے تھے‘ اِن شاء اللہ۔‘‘(۷)

(۳) شافعیہ کے نزدیک شوال کے روزے:

’’شوال کے چھ روزے ابوایوب انصاری ؓ کی مندرجہ بالا حدیث سے ثابت ہیں اور افضل یہ ہے کہ عید الفطر کے اگلے دن سے متصلاً رکھے جائیں‘ اور اگر متفرق بھی رکھے جائیں تو بہرحال سنت پر عمل ہو جائے گا۔‘‘(۸)

(۴) حنابلہ کے نزدیک شوال کے روزے:

’’شوال کے چھ روزے ابوایوب انصاری ؓ سے مروی نبی اکرم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہیں‘ پس انسان کے لیے مستحب ہے کہ وہ شوال کے چھ روزے رکھے۔‘‘(۹)

شوال کے روزوں کے متعلق بعض اہم فتاویٰ جات

شوال کے روزوں کے لیے یہ شرط نہیں کہ مسلسل رکھے جائیں‘ بلکہ انہیں متفرق اور مسلسل دونوں طرح رکھنا جائز ہے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان روزوں کا مطلقاً ذکر فرمایا ہے اور اس بات کا کوئی ذکر نہیں فرمایا کہ انہیں مسلسل رکھا جائے یا علیحدہ علیحدہ۔(۱۰)

شوال کے روزوں سے پہلے رمضان کے روزوں کی قضا: جس شخص کے ذمہ رمضان کے کچھ روزوں کی قضا باقی ہو اور وہ شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتا ہو تو مسنون یہ ہے کہ شوال کے چھ روزوں سے پہلے رمضان کی قضا ادا کی جائے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ’’جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے......‘‘ اور اگر رمضان کے روزوں کی قضا سے پہلے شوال کے روزے رکھ لیے تو وہ رمضان کے روزوں کے بعد نہ ہوئے بلکہ رمضان کے بعض روزوں سے پہلے ہوئے۔ اور پھر یہ کہ رمضان کے روزے تو فرض ہیں‘ لہٰذا پہلے انہیں مکمل کرنا افضل ہے۔(۱۱)

شوال کے روزے اکٹھے یا متفرق؟: شوال کے یہ چھ روزے سنت ہیں فرض نہیں‘ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی ہے‘ رکھنے کا حکم نہیں دیا۔ متذکرہ بالا حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ روزے مسلسل رکھے جائیں یا متفرق۔ البتہ انہیں جلد رکھ لینا افضل ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے:

﴿وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۸۵﴾ (طٰہٰ) ’’اور اے میرے پروردگار! میں نے تیری

طرف (آنے کی) جلدی اس لیے کی کہ تو خوش ہو۔‘‘

بہت سی دیگر آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ ﷺ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نیکی کے کاموں میں مسابقت اور مسارعت افضل ہے۔ ان روزوں کو ہمیشہ رکھنا واجب تو نہیں افضل ضرور ہے‘ کیونکہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَحَبُّ الْعَمَلِ اِلَی اللّٰہِ مَا دَاوَمَ عَلَیْہِ صَاحِبُہٗ وَاِنْ قَلَّ))(۱۲) ’’اللہ تعالیٰ کو وہ عمل بہت پسند ہے جسے عمل کرنے والا ہمیشہ سرانجام دے خواہ وہ عمل کم ہی ہو۔‘‘

شوال کے روزوں کی قضا؟: شوال کے ختم ہونے کے بعد ان روزوں کی قضا نہیں ہے‘ کیونکہ یہ روزے سنت ہیں‘ فرض یا واجب نہیں۔ اب ان کا وقت ختم ہو گیا‘ خواہ کسی عذر کی وجہ سے ختم ہوا ہو یا بغیر کسی عذر کے‘ کسی صورت میں ان کی قضا نہیں ہے۔(۱۳)

اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اعمالِ صالحہ کرنے اور ان پر مداومت و تسلسل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے‘ آمین!

حواشی:

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستة ایام من شوال...... ح ۱۱۶۴۔ و سنن الترمذی، ابواب الصوم‘ باب ما جاء فی صیام ستة من شوال

(۲) صحیح ابن خزیمة، باب فضل اتباع صیام رمضان بصیام ستة من شوال‘ ح۱۹۸۲۔ و سنن الکبریٰ للنسائی‘ ح۲۸۱۹

(۳) سنن ابی داوٗد‘ ح۸۶۴‘ سنن الترمذی‘ ح۴۱۳

(۴) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن‘ باب ذریة من حملنا مع نوح ...... ح ۴۴۸۷

(۵) تبیین الحقائق و حاشیة الشلبی‘ ج۱‘ ص ۳۳۲، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق‘ ج۴‘ ص ۱۲۸

(۶) المنتقی شرح الموطأ‘ ج۲‘ ص۲۱۲۔ و فقه العبادات علی المذهب المالکی‘ ج۱‘ ص۳۲۴۔

(۷) الاستذکار‘ ج۳‘ ص ۳۸۰

(۸) فقه العبادات لمذهب الشافعی‘ ج۱‘ ص ۵۵۹

(۹) الشرح الممتع علی زاد المستقنع‘ ج۶‘ ص ۴۶۴

(۱۰) فتاویٰ اسلامیة‘ شیخ ابن باز، ج۲‘ ص ۲۲۶

(۱۱) فتاویٰ اسلامیه‘ شیخ ابن باز‘ ج۲‘ ص۲۲۸

(۱۲) صحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان......

(۱۳) فتاویٰ اسلامیه‘ شیخ ابن باز‘ ج۲‘ ص۲۲۷

اقبال کا پیغام: اُمتِ مُسلمہ کے نام

محمد ندیم اعوان (پشاوری)

انیسویں صدی‘ ملت اسلامیہ کے لیے انتہائی پُر آشوب اور کٹھن امتحانات کا سندیسہ لے کر آئی۔ اس نے جہاں دیگر عالمی طاقتوں کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک کر اُن کی سلطنتوں کو تاخت وتاراج کر ڈالا‘ وہاں مسلمانوں کی تین سو سالہ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ بھی اسی صدی میں رونما ہوا۔ اس صدی نے ایک طرف تو ملت اسلامیہ کے خلاف فکری ونظریاتی یلغار کو فروغ دیا تو دوسری طرف مسلمانوں کے عظیم مذہبی وسیاسی لیڈروں کو دھرتی پر مزید مہلت دینے سے انکار کیا اور اُن کو بڑے عزت واحترام سے سپردِ خاک کر ڈالا۔ یوں تو تحریک آزادیٔ پاکستان میں موجود کسی بھی رہنما کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا‘ لیکن جس ہستی کی تعلیمات نے دوقومی نظریہ کو جنم دیا‘ ایک علیحدہ اسلامی ریاست کی تشکیل کی جدوجہد کے لیے مسلمانوں کو متحرک کیا‘ خوابِ غفلت کی اوڑھی ہوئی چادر کو چاک کرنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا سامان فراہم کیا‘ مسلمانوں میں اجتماعیت کی روح کو بیدار کیا‘ نوجوانوں کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑا‘ مایوسی میں اُمید کی فضا کو پروان چڑھایا‘ خودی کی تیغ سے مشینوں کا مقابلہ کرنے پر ابھارا‘ غلامی کی زنجیروں کو کچلنے کا سبق سکھایا‘ ناکامی کا سینہ چیر کر کامیابی کی راہ دکھلائی اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے لائحہ عمل وضع کیا اور شاہراہوں کی نشاندہی کی‘ آج دنیا اُس ہستی کو مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبال کے نام سے جانتی ہے۔

آپ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے جیسے ہی شعور سنبھالا تو والد مرحوم آپ کو مولانا غلام حسن کے پاس لے گئے‘ جو محلے کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ حسبِ دستور قرآن شریف سے آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ایک روز شہر کے معروف اور جید عالمِ دین مولانا سید میر حسن کا اتفاقاً وہاں سے گزر ہوا تو اس

ای میل: nts14303@gmail.com

بچے کو دیکھا جس کے چہرے سے عظمت اور سعادت کی جوت چمکتی نظر آ رہی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ شیخ نور محمد کا بیٹا ہے‘ تو فوراً اُن کی طرف چل پڑے اور آپ کے والد محترم کو سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو فقط مدرسے تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے جدید تعلیم بھی دلوائیں۔ مولانا سید میر حسن نے خواہش ظاہر کی کہ اقبال کو ان کی تربیت میں دے دیا جائے۔ والد محترم نے انکار کیا‘ لیکن مولانا کی طرف سے اصرار بڑھتا گیا اور بالآخر اقبال کو مولانا کے سپرد کر دیا گیا۔ اقبال نے مولانا کے ہاں اردو‘ فارسی اور عربی ادب کی تعلیم شروع کی اور اس کے ساتھ ہی ’’اسکاچ مشن سکول‘‘ میں بھی داخلہ لیا۔ اقبال زیادہ تر وقت اپنے استاد کی خدمت میں ہی گزارتے۔ مولانا اُن عظیم اساتذہ میں تھے جن کی زندگی کا بس ایک مقصد تھا: پڑھنا اور پڑھانا۔

مسلمانوں کی خیرخواہی کا جذبہ تو خیر اقبال کی گھٹی میں پڑا تھا‘ مگر مولانا میر حسن کی تربیت نے اس جذبے کو ایک علمی اور عملی سمت دی۔ بچپن ہی سے ان کے اندر وہ انہماک اور استغراق موجود تھا جو بڑے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ غرض اقبال کا بچپن ایک فطری کشادگی اور بے ساختگی کے ساتھ گزرا۔ قدرت نے انہیں صوفی باپ اور عالم استاد عطا کیا جس کے نتیجے میں اقبال کے ہاں احساس اور فکر کی نادر یکجائی نظر پائی جاتی ہے۔

سولہ برس کی عمر میں ۶ مئی ۱۸۹۳ء کو اقبال نے امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور تمغۂ امتیاز سے بھی نوازے گئے۔ اسی دوران میں آپ نے نواب مرزا خان (داغ دہلوی) کو شاگردی اور اصلاح کی درخواست لکھ بھیجی‘ جو قبول کر لی گئی۔ داغ اپنی بے مثال بصیرت سے اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھانپ گئے تھے اور بہت جلد یہ کہہ کر آپ کو فارغ کر دیا کہ اس ہیرے کو تراشا نہیں جا سکتا۔ اقبال اس مختصر سی شاگردی پر بھی ہمیشہ نازاں رہے اور یہی حال داغ کا بھی رہا۔ ۱۸۹۵ء میں اقبال نے ایف اے کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی اے کی تعلیم کے لیے آپ نے انگریزی‘ فلسفہ اور عربی کے مضامین کا انتخاب کیا۔ ۱۸۹۸ء میں امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا اور امتحان کا نتیجہ نکلنے پر پورے پنجاب میں اول آئے۔ گورنمنٹ کالج میں آپ کو پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا تعلق بھی میسر ہوا‘ جنھوں نے آگے چل کر اقبال کی علمی اور فکری زندگی کا ایک حتمی رُخ متعین کر دیا۔

یوں تو اقبال باضابطہ اور باقاعدگی سے مشاعروں میں شرکت نہیں کیا کرتے تھے لیکن نومبر

۱۸۹۹ء میں کچھ دوست حکیم امین الدین کے مکان پر ایک محفلِ مشاعرہ میں لے گئے' جہاں سننے والوں کا ایک ہجوم اور بڑے بڑے سِکّہ بند اساتذہ بھی موجود تھے۔ مبتدی کی حیثیت سے جب آپ کی باری آئی تو اپنی غزل پڑھنا شروع کی۔ جب اس شعر پر پہنچے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو بڑے بڑے استاد اُچھل پڑے اور بے اختیار داد دینے لگے۔ یہاں سے اقبال کی بحیثیت شاعر شہرت کا آغاز ہوا۔ اسی زمانے میں انجمن حمایت اسلام سے بھی تعلق کا آغاز ہوا جو آخر تک قائم رہا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے آپ کی تقرری ہوئی اور تقریباً چار سال کالج میں رہے۔ دورانِ تدریس دیگر مقالات کے علاوہ آپ نے ''علم الاقتصاد'' کے نام سے اردو زبان میں ایک مختصر سی کتاب تصنیف کی' جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع پر اولین کتابوں میں سے ہے۔ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر بھرتی ہوئے اور یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کو کالج سے تین سالہ رخصت لے کر یورپ چلے گئے۔ یورپ پہنچ کر مغربی تہذیب وتمدن اور اس کی روح میں کارفرما مختلف تصورات کو براہ راست دیکھنے کا موقع ملا۔ مغرب کے فکری' معاشی' سیاسی اور نفسیاتی غلبے سے آنکھیں چرائے بغیر انہوں نے عالمی تناظر میں اُمتِ مسلمہ کے گزشتہ عروج کی بازیافت کے لیے ایک وسیع دائرے میں غور وفکر شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان پر مغربی فکر اور تہذیب کا چھپا ہوا بودا پن منکشف ہو گیا۔ ۱۹۰۷ء میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے آپ نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری ملتے ہی بیرسٹری کے امتحانات کی تیاری کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں تمام امتحانات میں کامیاب قرار پائے اور رختِ سفر باندھ کر عازمِ ہندوستان ہوئے اور ۲۵ جولائی ۱۹۰۸ء کی رات کو دہلی پہنچے۔ اسی سال اگست کے مہینے میں آپ نے چیف کورٹ پنجاب میں وکالت شروع کی۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۰ء کو عارضی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے اور ساتھ ساتھ وکالت بھی جاری رکھی۔ اپنی دیگر مصروفیات کے باعث ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو کالج سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اورینٹل فیکلٹی میں بطور ڈین آپ کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں

یونیورسٹی کی تعلیمی کونسل کی رکنیت ملی اور اسی سال پروفیسرشپ کمیٹی میں بھی منتخب کیے گئے۔

یکم فروری ۱۹۱۲ء کو موچی دروازہ لاہور میں مسلمانوں کی طرف سے ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا' جس میں اقبال نے فرمایا:

> ''مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ اسلام کی تاریخ دیکھو' عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردّی اور بیکار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں' مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا تو یہی پتھر دنیا کے ایوانِ تمدن کی محراب کی کلید بن گیا' اور خدا کی قسم! روما جیسی باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔''

۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اپنی طویل نظم ''خضرِ راہ'' سنائی اور ۳۰ مارچ ۱۹۲۳ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اقبال نے اپنی معروف نظم ''طلوعِ اسلام'' پڑھی۔

۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو فلسطین میں یہودیوں کے بڑھتے ہوئے پُرتشدد غلبے اور خاص طور پر مسجد اقصیٰ پر ان کے ناپاک قبضے کے خلاف جلسے کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

> ''یہ بات قطعاً غلط ہے کہ مسلمانوں کا ضمیر حُبِ وطن سے خالی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ حُبِ وطن کے علاوہ مسلمانوں کے دل میں دینیت ومحبت اسلام کا جذبہ بھی برابر موجود رہتا ہے اور یہ وہی جذبہ ہے جو ملت کے پریشان اور منتشر افراد کو اکٹھا کر دیتا ہے اور کر کے چھوڑے گا اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اب حکومت برطانیہ نے فلسطین میں تحقیقاتِ حالات کے لیے ایک کمیشن بھیجنا منظور کیا ہے' مگر میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتماد نہیں۔''

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جب کہ قائداعظم پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے' آپ نے وہ تاریخی خطبۂ صدارت پیش کیا جو ''خطبۂ الٰہ آباد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خطبے میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے اندر ایک آزاد مسلم ریاست کا ٹھوس اور غیر مبہم خاکہ پیش کیا گیا۔ ۶ مئی ۱۹۳۶ء کو قائداعظم محمد علی جناح علامہ اقبال سے ملنے ''جاوید منزل'' تشریف لائے اور مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا رکن بننے کی دعوت دی' جسے اقبال نے اپنی شدید علالت کے باوجود بخوشی قبول کر لیا۔ ۱۲ مئی کو اقبال دوبارہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر

مقرر ہوئے۔ آپ کی تعلیمات اور قائداعظم کی ان تھک کوششوں سے دنیا کے نقشے پر ایک اسلامی ریاست ''پاکستان'' کے نام سے معرض وجود میں آئی۔

علامہ اقبال فقط ایک شاعر نہیں تھے' بلکہ وہ حقیقی معنوں میں ایک عظیم مفکّر' مصنّف' قانون دان' سیاست دان' صوفی اور تحریک پاکستان کی اہم ترین شخصیات میں سے تھے۔ بحیثیت سیاست دان ان کا سب سے نمایاں کارنامہ نظریہ پاکستان کی تشکیل ہے۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال کو مفکّرِ پاکستان اور مبشر پاکستان کہا جاتا ہے' اگرچہ وہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں امت کی اجتماعیت' فلسفہ خودی' معاشرے میں عورت کا مقام وکردار' مغربی تہذیب پر تنقید اور نوجوانوں کی تعمیر وتشکیل کو کثرت سے موضوع سخن بنایا ہے۔

علامہ مرحوم مسلمانوں کے اتحاد واتفاق اور امت کی اجتماعیت کے لیے بیتاب تھے اور فرمایا کرتے تھے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

وحدتِ ملی ان کا خاص موضوع ہی نہیں تھا' بلکہ اس کے اتحاد کے لیے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے۔ جوابِ شکوہ میں مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تم ایک خدا کو حقیقی معنوں میں ماننے والے ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ تم گروہوں اور فرقوں میں تقسیم نہ ہوتے بلکہ ایک ہوتے۔ مسلمانوں کی تفریق نے اقبال کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی' دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی' اللہ بھی' قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء کو علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کے نام ایک خط میں تحریر کیا: ''میں اُس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے۔ آپ کے نزدیک چھ عوامل انسان کی خودی کو مستحکم بناتے ہیں: (۱) عشق (۲) فقر (۳) جرأت (۴) برداشت (۵) کسب حلال (۶) تخلیق — اور چار عوامل خودی کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں: (۱) خوف (۲) بھیک (۳) غلامی اور (۴) فخر۔ (سید عبدالواحد' Iqbal His Art and Thoughts' ص ۴۵)

اقبال پر مغرب کی تہذیب سے مرعوب طبقہ کی طرف سے اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے تعصب اور تنگ نظری سے کام لے کر عورت کی ذات اور اُس کے کردار کو معاشرے میں محدود کر دیا ہے اور وہ جدید معاشرے میں عورت کو وہ مقام نہیں دے پائے جو اُس کا حق تھا۔ چونکہ اقبال کے تمام نظریات کی بنیاد خالص اسلامی تعلیمات پر ہے اس لیے وہ عورت کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات کی خوبصورتی اور توازن عورت ذات کا ہی مرہونِ منت ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

اقبال عورت کی اُس تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں جس کی بدولت عورت کو اُس کے فرائض اور اُس کی صلاحیتوں سے آگاہ کیا جائے۔ عورت کے لیے اُس تعلیم کے اقبال ہمیشہ سے مخالف رہے ہیں جو عورت کی فطرت کو ہی تبدیل کر دے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق ومحبت کے لیے علم و ہنر موت

اقبال نے اپنے کلام میں مغربی تہذیب کی خوبیوں کا برملا اعتراف کرتے ہوئے اس کی خامیوں پر کڑی تنقید کی ہے اور مسلم معاشرے کو ان کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کے نزدیک اس تہذیب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ مادی ترقی اور کسبِ زر کو زندگی کی معراج سمجھتی ہے۔ انسانی اخلاق اور روحانی اقدار کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ چنانچہ انسانی زندگی میں توازن' اعتدال اور ہم آہنگی قائم نہ رہ سکی۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم' یہ حکمت' یہ تدبّر' یہ حکومت — پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات

اقبال کو مغربی تہذیب سے ہمیشہ یہی شکایت رہی ہے کہ اس نے حضرت انسان کو مادی حیثیت سے غیر معمولی طاقت بخش دی ہے اور اُسے ظاہری شان وشوکت سے مالا مال کر دیا ہے' لیکن حقیقی راحت اور آسودگی پہنچانے کے بجائے اُس کی موت کا پروانہ بن گئی ہے۔ انہی آثار

کو دیکھ کر اقبال نے پیشین گوئی کی کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

اقبال کو اپنے ہم وطنوں سے بھی ہمیشہ یہی شکوہ رہا ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کو ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں حالانکہ ترقی کے لیے لباس کی خاص وضع قطع، اپنی زبان چھوڑ کر بدیسی زبان اختیار کر لینا اور عورت کو بے پردہ کر دینا ضروری نہیں، بلکہ یہ تو وہ راستہ تھا جو ہمیں تہذیبی اور فکری اعتبار سے مفلس بنا رہا تھا۔

اقبال کی طبیعت میں سوز و گداز اور حُبِ رسول ﷺ اس قدر تھا کہ جب کبھی ذکر رسول ﷺ ہوتا تو آپ بے تاب ہو جاتے اور دیر تک روتے رہتے۔ ''روزگارِ فقیر'' میں سید وحید الدین لکھتے ہیں: اقبال کی شاعری کا خلاصہ، جوہر اور لب لباب عشق رسول ﷺ اور اطاعت رسول ﷺ ہے۔ ان کا دل عشق رسول ﷺ نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ذکر رسول پر ہچکی بندھ جاتی، آواز بھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ سکوت اختیار کرتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں۔ اقبال کے ذہن میں عشق و مستی کا اوّل اور آخری محور ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ محور ہے نبی کریم ﷺ کی ذات جو ذاتِ تجلیات ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

اقبال نوجوان نسل کو اعلیٰ اوصاف و کردار سے بہرہ ور کرنے اور اُنھیں صحیح راہ پر گامزن کرنے کے لیے انتہائی فکر مند تھے۔ اقبال نے نوجوانوں کو پیغام دیا کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل انسان بننے کی کوشش کریں اور اپنے آپ کو اُن اوصاف سے آراستہ کریں جو خود اُن کی نشوونما اور ترقی کے لیے ضروری ہیں اور جو عظیم قوم کی تعمیر و تشکیل کے لیے معاون بن سکتی ہیں۔ اقبال کا مثالی نوجوان خوددار، تعلیم یافتہ، یقین محکم اور عمل پیہم کی خوبیوں کا حامل نوجوان ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

علامہ اقبال نوجوانوں کی بے عملی اور بے ہمتی سے بددل ہوتے ہوئے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں
اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

اقبال نے اپنی نظم ''ایک نوجوان'' کے نام میں نوجوانوں کو اپنے اندر عقابی روح اور شاہین جیسی خصوصیات پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آج کا پاکستانی نوجوان علامہ اقبال کی فکر سے واقف ہے؟ کیا پیغامِ اقبال ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ اقبال کے یومِ ولادت کو جشن کے طور پر منایا جائے اور بس۔ مشاہدہ ہے کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اقبال کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات تک کا علم نہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں نوجوانوں کا مقصد دولت اور status کا حصول ہے، جبکہ اقبال نے نوجوانوں کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ''جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے'' کے پیرائے میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے کائنات کی تسخیر کا کام اپنے شاہینوں یعنی نوجوانوں کے سپرد کیا ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال حسّاس دل و دماغ کے مالک تھے۔ آپ نے معاشرے کو مثبت رخ پر سوچنے کی فکر دی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک آزاد اور خودمختار قوم بننے کی ترغیب دی۔ پیغامِ اقبال مسلمانوں کے لیے غلامی سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر ہے۔ اقبال نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی اور اسلامی عظمت کو اجاگر کیا۔ ان کی کئی کتابوں کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، چینی، جاپانی اور دوسری کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں، جس سے بیرون ملک میں بھی لوگ آپ کے معترف ہیں۔ بلاشبہ اقبال کو ہم سے بچھڑے ہوئے تقریباً ۸۰ سال گزر چکے ہیں لیکن آج بھی وہ اُمتِ مُسلمہ کے لیے فکرمند حضرات کے دلوں میں زندہ ہیں۔

June 2018
Vol.67

Regd. CPL No.115
No.6

Monthly Meesaq Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام
جاری کردہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داخلے جاری ہیں

رجوع الی القرآن کورسز (پارٹ I اور II)

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I) برائے مرد و خواتین

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمۂ قرآن (مع تفسیری توضیحات)
3. سیرت النبی ﷺ
4. قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II) صرف مرد حضرات

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان و ادب
9. اضافی محاضرات

نوٹ:
داخلے کے خواہشمند 23 جولائی تک اپنی رجسٹریشن ضرور کروالیں۔ رجسٹریشن نہ ہونے کی صورت میں لیٹ داخلہ نہیں دیا جائے گا۔
پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

- انٹرویو کی تاریخ، 23 جولائی (صبح 8:30 بجے)
- کلاسز کا آغاز، 24 جولائی (صبح 8:00 بجے)
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

برائے رابطہ
قرآن اکیڈمی
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 35869501-3
email:irts@tanzeem.org
ملک شیر افگن
0300-4201617